گھنے جنگلوں میں

حسین الحق

گھنے جنگلوں میں

حسین الحق

جُملہ حقوق بحقِ ایمن نشاط محفوظ

(تیسرے افسانوی مجموعہ "بارش میں گھر امکان" کا نیا رنگ و روپ، حک و اضافہ کے ساتھ)

نام کتاب : گھنے جنگلوں میں

نوعیت : افسانوں کا انتخاب

صفحات : ایک سو آٹھ

سن اشاعت : ۱۹۸۹ء

قیمت : پچیس روپئے

کتابت : قمر نظامی

طباعت : تاج پریس باری روڈ، گیا

تعداد : ایک ہزار

ناشر

قاضی علی حق اکیڈمی

آمڈاری ہاؤس، شاہ ہارون، سہسرام

۸۲۱۱۱۵ (بہار)

عین تابش

کے نام

کشش ہے آئینوں میں رنگ بام و در میں باقی ہے
کوئی منظر ابھی اُجڑے ہوئے اُس گھر میں باقی ہے
گجر بجنے کو ہے، اُٹھیں، کریں ملبوس زیب تن
صبوحی اپنے حصّے کی ابھی ساغر میں باقی ہے

(عین تابش)

فہرست

واحسرتا	۵
بارش میں گھرا مکان	۱۷
بہ اُمیدآں کہ روزے	۲۶
سنوز	۴۱
گھنے جنگلوں میں	۴۹
کربلا	۶۰
ربّا ربّا	۸۱
گھٹن	۹۶
سولی اوپر سیج پیا کی	۱۰۲

وَاحسرتا

سب سردیوں میں کِھلا چاند بن گئے تھے۔
اور سردی اُن کی ریڑھ کی ہڈی چیر کر اُن کے اندر اندر اُتر رہی تھی اور اپنا آپ سارا کا سارا اُن کے آپ میں اُتارتی جا رہی تھی۔
پارک کے اندر دور دور تک دسمبر کی ٹھنڈی شام اُتر آئی تھی دیودار اور چیڑ کے درختوں پر کُہاسہ گر رہا تھا، ابھی پانچ بھی نہیں بجا تھا مگر بادلوں کے ٹکڑوں نے سورج کو چھپا لیا تھا اور پورے پارک میں سردیوں میں کِھلے ان پانچ چاندوں کے علاوہ کوئی نہ تھا، دربان بھی سردی سے بچنے کے لئے پارک کے ایک گوشے میں بنی لائبریری کی دالان میں گرم کپڑوں میں لپٹا تھرتھرا رہا تھا۔
"یار لگتا ہے ناصر ہتھے چڑھ گیا" جنید کے لہجے پر مایوسی کا عنصر حاوی تھا۔
"کیا پتہ ہتھے چڑھا یا بلی چڑھا!" افروز آہستہ سے بولا۔
"تم کو شرم نہیں آئی؟ بلی کہتے ہو .... شہید کہتے ہوئے شرم آتی؟"
اعجاز کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔
"کیسی ظالمانہ باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟" رؤف تڑپ اُٹھا۔ صرف اس لئے کہ وہ یہاں پہنچا نہیں، تم لوگ اُس کی موت کی نوعیت پر بھی بحث کرنے لگے؟"
جنید، افروز، اعجاز اور رؤف مسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔
شہزاد احمد خاموش بیٹھا بس سامنے لائبریری کی دالان کی طرف دیکھے جا رہا تھا جہاں دربان گرم کپڑوں میں لپٹا تھرتھرا رہا تھا۔

"لیکن کیسا بھیانک منظر تھا یار؟" افروز شاید سوچ کر سہم گیا تھا۔
"مگر سارا پروگرام سالوں نے کِر کرا کر دیا ورنہ آج تو ہم لوگ اسمبلی میں گھس ہی جاتے۔" اعجاز کے لہجے میں تاسّف کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔
"ہاں اور کیا؟" جنید بولا۔ شہید میموریل تک تو ہم لوگ پہنچ ہی چکے تھے، وہاں سے اسمبلی کتنی دور ہے؟ اگر دس منٹ وہ سب اور ٹھہر جاتے تو سارا مرحلہ طے ہو جاتا۔"
"یار پتہ نہیں منظور کا کیا ہوا؟" اعجاز کو اچانک یاد آیا۔ "بم کا اسٹاک تو اُسی کے پاس تھا۔"
"کیا؟" شعارِ احمد اُچھل پڑا۔ "بم بھی تھا۔؟"
"ہاں مُنے "بم بھی تھا۔" اعجاز نے بھنچا بھنچا قہقہہ لگایا۔ "تم کیا سمجھ رہے تھے؟ ہم لوگ کیا گڈے گڈی کی شادی کرنے گئے تھے۔؟"
"مگر یار اس کی کیا ضرورت تھی؟ تم لوگوں نے بتایا تھا کہ ہم لوگ اپنا احتجاج درج کرائیں گے۔"
"تو وہاں احتجاج ہی تو درج ہوا... اور کیا ہوا؟" افروز بولا۔
"یہ احتجاج تھا؟"
"ہاں پیارے یہ احتجاج تھا۔"
"یار کیا بات کرتے ہو تم لوگ؟" شعار انتہائی جھلاہٹ کا شکار موڈ کا تھا۔ یہ احتجاج تھا حالات کو ہم لوگ کھینچ کر فائرنگ پوائنٹ تک لے آئے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ احتجاج تھا۔"
"ہاں بھولے راجہ یہاں احتجاج ایسے ہی ہوتا ہے۔"
"تو پھر یار۔ ہنگامے اور احتجاج میں کیا فرق ہے؟"
اِس پر سب دوست کچھ دیر چُپ رہے... پھر رؤف بولا۔ "جانِ من یہاں تو ہر احتجاج ہنگامہ ہے اور ہر ہنگامہ احتجاج۔"
پھر اس سے پہلے کہ بات کچھ اور آگے بڑھے، اچانک سب کو چپ لگ گئی.... جیسے سب کو سکتہ مار گیا ہو....
رات آ چکی تھی، جاڑے میں تو سورج ساڑھے پانچ بجتے بجتے ہی غروب ہو جاتا ہے اب تو

ساڑھے چھ بج چکا تھا، نزدیک و دور ہر چہار سمت رات کا ڈیرا تھا اور پارک میں لگے دودھیا بلبوں کی دودھیا روشنی جھک جھور ٹھنڈی رات میں گرتے کہاسے میں رل مل کر یوں مند مند دکھائی دے رہی تھی جیسے قمقموں کو بھی نیند آ رہی ہو ... اور دور پارک کے ایک گوشے میں بنی دالان میں، پھٹے پرانے گرم کپڑوں اور کمبل میں لپٹا دربان اونگھ اونگھ جا رہا تھا ....." اور ان پانچوں کو چپکی لگی ہوئی تھی .... جیسے سب کو سکتہ مار گیا ہو!

سب کے سب سامنے پارک کے چاروں طرف پھیلی سڑک کو گھور رہے تھے.."

جہاں اسمبلی کی طرف سے آتی ہوئی سڑک پر سے ... "

پولیس کی گاڑیاں مسلسل قلبِ شہر کی طرف دوڑ رہی تھیں ...."

..... سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ ...." جنید بڑبڑا رہا تھا۔

" بارہ گاڑیاں ہیں نا؟" افروز سرگوشیوں میں بولا، شاید اُس نے بھی گنا تھا۔

" ہاں! "

" یار معاملہ کیا ہے؟" رؤف گھبرایا گھبرایا دکھائی دینے لگا۔

" تشویش کی بات ہے"۔ اعجاز بولا ... " سب کا جماؤ تو نارتھ بلاک سے شہید میموریل تک تھا پھر ادھر رُخ کیوں مُڑا؟ "

" ادھر یہ کہاں جا سکتے ہیں؟" جنید نے جیسے خود سے سوال کیا " تین محلے تو اُن کے ہیں اور پارک کے آس پاس ہی ہیں، یہاں سے اِتنا اندازہ تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ اُن تین محلوں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔" " مگر باقی محلے جو اپنے ہیں شاید وہاں بھی کوئی گڑبڑی نہیں ہے۔" جنید قیاس کے سہارے کسی فیصلے تک پہنچنا چاہ رہا تھا۔ " کیوں کہ اپنے محلے بھی اُن تین محلّوں سے متصل ہیں۔ اگر اُن میں کوئی گڑبڑی ہوتی تو سامنے کے ان تین محلّوں میں بھی کچھ نہ کچھ کسمساہٹ تو ضرور محسوس ہوتی۔"

" یار ... اِس کا مطلب یہ ہوا کہ سیٹی گڑبڑ ہے؟" رؤف کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی، اس کا گھر سیٹی میں تھا۔ کسی نے کچھ کہا نہیں ... سب بس سامنے کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ " مگر یار ... ناصر کا کیا ہوگا؟ جب چاروں طرف پولیس کی گاڑیاں دوڑنے لگیں تو

شعار احمد کو ناصر یاد آگیا۔ "ہاں یار! ناصر کی بات تو ہم لوگ بھول ہی گئے۔" اعجاز چونکا... "اب تک تو اُس کو آجانا چاہیے تھا۔"

"تم نے سارا پروگرام اُس کو بتا دیا تھا؟ شعار نے سوال کیا۔ اس پر اعجاز چپ رہا۔ "میں نے پوچھا، سارا پروگرام اس کو معلوم ہے نا؟" شعار نے پھر سوال کیا۔

"مگر یار! اب واقعی انتہا ہوگئی۔" جنید کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔

سب نے اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں یارو ... دیکھتے کیا ہو؟ اب اس سے زیادہ انتہا کیا ہوگی کہ ہمارے ہی خلاف فیصلہ کر دیا جائے اور جب صدائے احتجاج بلند کرنے جائیں تو گولیوں کی بارش ماری جائے۔"

"مگر احتجاج تو اور جگہوں میں بھی ہوا، گولی تو کہیں نہیں چلی؟" شعار بھی اپنا اصل سوال، ناصر کی بات بھول کر، اِن کے ساتھ بحث میں شامل ہوگیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ رؤف نے دخل دیا ... اور جگہ نہیں چلی ... ارے یہاں تو چلی؟"

"اور پھر ... کوشش کہاں نہیں کی گئی؟" جنید نے کہا ... کامیابی نہیں ملی ہوگی ... یہاں کامیابی مل گئی ... موقع مل گیا ... شروع ہو گئے ..."

"مگر یہ سوچنے والی بات ضرور ہے۔" افروز بولا۔ اگر جنید کی بات مان بھی لی جائے تو پھر سوال اُٹھتا ہے کہ یہاں کامیابی کیوں مل گئی؟"

رؤف، جنید، افروز ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے، اعجاز سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا اور شعار سر جھکائے خاموش بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔

"ارے ارے ... یہ کیا؟" اچانک اعجاز اپنی جگہ سے اُچھل کر کھڑا ہوگیا .... سب کی نگاہ اعجاز کی نگاہ کی سیدھ میں اُٹھی .... پورب کی سمت بہت دور پر آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے ..."

"یار یہ .... یہ .... رؤف نے شدتِ جذبات میں اعجاز کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا ... "یار یہ شعلے دُور پر ہیں ... یار یہ سب کچھ سیٹی میں ہو رہا ہے ..."

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" کسی دوست نے کہا، اور سب کے دل میں ہمدردی کی اِک لہر اُٹھی۔

سبھی جانتے تھے کہ رؤف اپنے محلے میں تنہا ہے اور اُس کا محلّہ بغل کے محلے کی وجہ سے خاصا SENSATIVE ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورتِ حال میں رؤف کی بے چینی بالکل بجا تھی۔ "یار مجھے جانا چاہیئے۔" رؤف بے خودی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔

صورتِ حال ایک ایسے موڑ تک پہنچ چکی تھی کہ اب کوئی جانے والے کو رُکنے کا مشورہ دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا، سب نے خالی خالی نگاہوں سے رؤف کو دیکھا... رؤف آگے بڑھا مگر اچانک ٹھٹھک گیا۔

ایک گاڑی کچھ اعلان کرتی گزر رہی تھی۔

سب نے اعلان سُنا اور ایسے دکھائی دینے لگے جیسے سب پر ایک ساتھ فالج گر گیا ہو!!

"اِس کا مطلب یہ کہ معاملہ بہت سنگین رُخ اختیار کر چکا ہے۔" جنید آہستہ سے بولا

"ظاہر ہے، ورنہ عام طور پر تو دفعہ ۱۴۴ سے ہی کام چل جاتا ہے۔" افروز نے سرگوشی کی۔ "تم لوگوں کی بھی بات؟" اعجاز نے بات کاٹی۔ "کبھی کبھی یہ معاملے کو سنگین کرنے کے لیے بھی ایسا کرتے ہیں۔"

"ایسی پیچیدہ صورتِ حال میں قیاس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔" شعارِ احمد بہت دیر کے بعد پھر بولا۔ شعار کی بات پر اعجاز ہنس دیا۔ "پروفیسر شعار احمد! آپ اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھیں۔" شعار چپ ہو گیا اور اُدھر دیکھنے لگا جدھر دربان پھٹی کمبل میں لپٹا تھر تھرا رہا تھا۔ "مجھے جانا چاہیئے۔" رؤف پھر کھڑا ہو گیا۔

"مگر کیسے جاؤ گے؟ پاس (PASS) بھی تو نہیں ہے۔"

"بھئی مجھے کسی بھی طرح جانا چاہیئے۔"

"یہاں سے اگر روانہ بھی ہو جاؤ تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم وہاں پہنچ پاؤ گے؟" افروز نے سوال کیا۔ "میرے خیال میں تو اس کی کوئی اُمید نہیں ہے۔" اعجاز بولا۔

"مگر مجھے جانا چاہیئے۔" رؤف ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "میں تم لوگوں کی طرح مشترکہ خاندان کا ایک حصہ نہیں ہوں، بچے گھر میں تنہا ہیں۔" اتنا کہتے کہتے اچانک اُسے شاید کچھ اور یاد آ گیا، وہ بالکل بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا، اس کا سانس دھونکنی کی طرح

چل رہا تھا، چہرہ تو اندھیرے میں نہیں دکھائی دے رہا تھا مگر سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ انتہائی گھبرایا ہوا تھا... "مجھے کسی بھی حال میں پہنچ جانا ہے۔"

"کیا بات ہے ... اِس طرح اچانک کیوں پریشان ہو گئے؟" شعار نے پوچھا۔

"میں گھر سے چلا تو بیوی مارکٹنگ کے لئے نکل رہی تھی... بچے گھر میں بالکل تنہا تھے۔"

"تم دو بجے کے قریب نکلے تھے ... اب تک لوٹ نہ چکی ہو گی؟"

"سو تو ہے ... لیکن نہ لوٹی تو؟"

تو! ... تو اس کا جواب کس کے پاس تھا؟ ... اِس "تو" کا جواب کس کے پاس ہے؟

"یہاں تو کم از کم ہم محفوظ ہیں"۔ اعجاز بولا۔ کہ اِس وسیع میدان کے بارے میں کوئی سوچ نہ سکے گا۔ اور اس طرح رات گزار کر صبح کو اپنے اپنے گھروں تک پہنچا جا سکتا ہے لیکن یہاں سے نکل کر اگر کسی بھیڑ میں گھر گئے تب بھی... اور اگر جوانوں کے ہتھے چڑھ گئے تب بھی۔ ہمیں اپنے اپنے گھروں تک پہنچنا نصیب نہیں ہو گا۔" اعجاز کی اِس دلیل پر رؤف نے بوکھلا کر اعجاز کو دیکھا۔ رؤف کے پاس اعجاز کی اس بات کا جواب نہیں تھا۔!

رؤف کھڑا رہا ... رات نہ ایک پل اِدھر سرکی نہ ایک پل اُدھر بڑھی ... پولس کی گاڑیاں پارک کے چاروں طرف دوڑتی رہیں ... دور پر آگ کے شعلے اُٹھتے رہے اور رؤف سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ سٹی میں ہو رہا ہے اور اُس کا گھر سٹی میں ہے اور گھر میں بچے اکیلے اور وہ گھر پہنچنا چاہتا ہے ... مگر وہ گھر جا نہیں سکتا!

ایسے ہی حالات میں ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔" اعجاز بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "اب تم تاریخ کے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔" شعار احمد چپ نہ رہ سکا۔

"یار ... اِسے تم تاریخ کا پھٹا کہتے ہو ... ارے یہ تو تاریخ کا چراغ ہے۔" اعجاز کو غصہ آگیا۔

"تم بھی کیا بات کرتے ہو پیارے؟" شعار بول اُٹھا۔ "جان کے خوف سے بھاگ جانے کو تاریخ کا چراغ کہہ رہے ہو!"

"ارے ارے تمہارا دماغ خراب ہے؟" اعجاز غصے میں کھڑا ہو گیا ہے۔ حضور کے عمل کو تم جان کے خوف سے بھاگنا کہہ رہے ہو؟"

"تم اپنی اصلاح کرو"۔ شعار بہت آسان سے بولا۔ "میں تمہارے عمل کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔

"اچھا مانا" اعجاز نرم پڑا "تو کیا حضورؐ کو جان کا خطرہ نہیں تھا؟"

"مگر حضورؐ نے جان کے خوف سے ہجرت نہیں کی تھی"۔ شعار زوردار لہجے میں بولا

"تو یہاں بھی صرف جان کے خوف کا مسئلہ درپیش نہیں ہے" اعجاز نے شعار کی بات کاٹی۔ "شریعت نرغے میں گھر چکی اور تم ابھی تک جان کے خوف کی بات کر رہے ہو؟"

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ کھلتا ہے کہ ہمیں اپنے لئے نہیں، شریعت کے لئے پناہ گاہ تلاش کرنی چاہیئے۔"

"یہی کہہ لو۔"

"مگر، ہجرت کا فلسفہ پناہ گاہ کی تلاش کا فلسفہ نہیں ہے۔"

"تب کیا ہے فلسفی صاحب؟" اعجاز ہنسا، پھر موڈ میں آگیا تھا۔

"ہجرت دراصل زرخیز زمینوں کی تلاش کا استعارہ ہے۔"

"خوب صورت الفاظ کی دوکان سجاتا ہے... یہ ہمارا شعار احمد" افروز نے رؤف کے کان میں سرگوشی کی اور ہنس دیا۔

"ارے یار... تم لوگ کہاں کی بحث لے کر بیٹھ گئے؟ اُدھر ناصر کا پتہ نہیں، اِدھر ہنگامہ شروع ہو چکا اور تم لوگ فلسفہ کی دنیا میں گم ہو؟" جنید جھلا گیا۔

"ناصر کو سارا پروگرام معلوم تھا؟" شعار پھر اعجاز کی طرف متوجہ ہوا۔

"یار! وہ پروگرام کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ــــ" اعجاز آدھی بات کہہ کر رک گیا

"ہاں ہاں... کیا معاملہ ہے پروگرام کا؟" شعار ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔

"جنید! تم ہی بتا دو یار، میرا اب دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔" اعجاز جنید کی طرف مڑا

"یار مجھے بھی کیا پتہ؟ تم نے کہا چلو، میں ساتھ ہو لیا۔" جنید نے اپنی بات چھڑا لی۔

"اچھا اچھا تمہیں پتہ نہیں... ہاں تم تو بیچ راہ میں ملے تھے... افروز! تم ہی بتا دو بھائی میرا تو اب بولنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"لو... میں کون سا، ابتدا سے انتہا تک کا، تمہارا رفیق ہوں، مجھے تو رؤف نے کھینچ لیا۔"

"اور میرا معاملہ یہ ہے کہ"..... رؤف پھیکی ہنسی ہنسا ... جب جلوس میرے محلّے سے گزر رہا تھا تو میری رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور میں ساتھ ہولیا ... پھر جلوس ہی میں تم لوگوں سے ملاقات ہوئی" ——— "جنید، افروز، رؤف اور میں"..... شعار احمد نے بڑے آسان سے کہا ... ہم سب لوگ گویا بیچ راہ میں آن ملنے والے رفیقوں میں ہوئے..... تو اب لے دے کر اعجاز ... شعار احمد اعجاز کی طرف متوجہ ہوا ... "تم ہی بچ جاتے ہو۔"!

شعار احمد کی اس بات پر سب نے ہنکاری بھری اور سب کی توجہ اعجاز کی طرف ہوئی ... مگر اعجاز بہت دیر تک، سب سے بے خبر، چپکا بیٹھا رہا، جانے کیا سوچتا رہا، پھر سر اٹھائے بغیر دھیمی آواز میں بولا "ہاں جلوس کی شروعات ہی سے جلوس کے ساتھ ہوں مگر پروگرام کا تو سچ پوچھو تو مجھے بھی پتہ نہیں ... بس اتنا علم ہے کہ منظور کو سب معلوم تھا۔"

اور منظور کے پاس بم کا اسٹاک تھا۔" شعار احمد ہنسا۔

"مگر شعار احمد"۔ افروز نے سوال کیا۔ جلوس والوں کی طرف سے وہاں کوئی بم تو چلا نہیں؟"

"اعجاز جانیں ... بم کی بات انہی نے بتائی ہے۔"

"بم میں نے بھی دیکھا نہیں تھا۔" اعجاز بولا۔ "باتوں باتوں میں منظور بولا تھا کہ اگر آج ہم لوگوں کو روکا گیا تو بم مارا جائے گا۔"

"اور بس اتنی سی بات پر تم نے سمجھ لیا کہ اس کے پاس بم کا اسٹاک ہے؟" شعار پھر جھلا گیا۔

"یار ناصر والی بات تو پھر رہ گئی" افروز نے یاد دلایا۔

"مارو سالے کو" جنید کو غصہ آگیا۔ سالا ہمیشہ یہی کرتا ہے، پچھلی مرتبہ کی بات یاد ہے نا؟ جنتر منتر میں جب ہم لوگ راستہ بھول گئے، اس وقت بھی وہ ہم لوگوں کے ساتھ نہیں تھا۔"

"مگر یار!" افروز بولا۔ "وہ بھی عجب حادثہ تھا، آج بھی یاد آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، وہ تو خدا بھلا کرے ڈاکٹر شرما کا ورنہ ہم لوگ تین کے بجائے تیس گھنٹے بھی چکراتے رہتے، تو شاید راستہ نہ ملتا۔"

"اور وہ ... اکیلے گم ہوا اور اکیلے ہی راستہ ڈھونڈ نکالا۔

"ہمیں نجات کے لئے مسیحا چاہئے، وہ اپنی صلیب خود اٹھاتا ہے۔" شعار نے سرگوشیوں میں کہا

"دکھ سکھ مل کر سہنے سے کم ہو جاتا ہے یار" جنید کہنے لگا۔ ایسے لوگ کتنے ہوں گے جو سب کچھ خود ہی سہن کر لیں۔"

"کم ہوتے ہیں مگر ہوتے تو ہیں ... اور ہر دور میں ہوتے ہیں"۔ افروز نے کہا

"وہاں بھی اس نے یہی کہا۔" افروز جنتر منتر سے شہید میموریل کی طرف مڑ چکا تھا ... ساتھ چلا اور پھر وہاں پہنچ کر آگے بڑھ گیا۔"

"پتہ نہیں صرف آگے بڑھنے والوں میں رہا یا مشتعل ہونے والوں میں شامل ہو گیا۔" شعار نے جیسے خود سے پوچھا۔

"غلط الزام لگانا اچھی بات نہیں ہے"۔ اعجاز نے فوراً بات کاٹی۔ مشتعل صرف پولیس والے ہوئے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" افروز نے جوابی حملہ کیا۔ تم تو ہمارے ساتھ سب سے پیچھے تھے۔"

"اور تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اعجاز کی بات غلط ہے، جب کہ تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ تم بھی پیچھے ہی تھے۔" جنید ہنسا۔

"ہاں ایسے میں دو ٹوک فیصلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" شعار نے بیچ کی راہ نکالی۔

"مگر یار ... ناصر؟" جنید کو پھر یاد آیا۔

"ناصر ... ناصر ... ناصر ..." رؤف بلبلا کر پھر کھڑا ہو گیا۔ اُدھر پورا محلہ جل رہا ہے اور تم لوگ بس ایک ناصر کی فکر میں گم ہو ... ..."

سب چپ ہو گئے، رؤف سے سب کو ہمدردی تھی مگر جس صورت حال میں وہ گھرے ہوئے تھے اُس صورت حال سے چھٹکارا پائے بغیر کچھ ممکن نہ تھا۔ اور اُس صورت حال سے نکل جانا ... رؤف سمیت سبھی اس نقطہ پر آ کر سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے کی قوت کھو بیٹھے۔ رؤف کی اس بات پر بھی سب چپ ہو گئے کہ ایسی صورت حال میں چپ رہنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ مگر خاموشی طاری ہوئی تو صورت حال کا بھیانک پن چمکا۔ دسمبر کی سرد اندھیری رات ... کٹکٹاتا جاڑا ... جسم کو برف بناتی سردی ... ۸ بجے شب کا عمل ... سارے شہر میں کرفیو ... دُور پر اُٹھتے شعلے ... گم شدہ یار کی فکر ... سامنے لائبریری کی دالان میں پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹا تھرتھراتا اور اونگھتا دربان ... اور چاروں اُور جھوم جھوم کر برستی برسات

اور چیخ چیخ کر دوڑتی پولیس کی گاڑیاں ...

"یار، یہاں تو اب جان نکل جائے گی ... دالان میں کیوں نہ چلا جائے؟" افروز نے تجویز رکھی

"ہاں کم از کم کھلے آسمان کی مصیبت سے بچا جا سکتا ہے۔" جنید نے حامی بھری۔

"نہیں۔ ایسی صورت حال میں کسی بھی اجنبی کا سامنا مناسب نہیں۔" شعار نے اختلاف کیا۔ ——— "پہلی مرتبہ ایک اچھی اور صحیح بات تم نے کہی ہے۔" اعجاز ہنسا ...

رؤف اپنے آپ میں گم تھا ——— "پڑوسیوں سے تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟" شعار نے رؤف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا ——— "تعلقات کا کیا پوچھتے ہو بہت اچھے تعلقات ہیں، مگر ایسے وقتوں میں تعلقات بے معنی بھی تو ہو جاتے ہیں اور پھر مانا کہ پڑوسیوں کی طرف سے کوئی بات نہ ہو، سارا محلہ اگر بے نیت ہو جائے تو پڑوسی کیا کر لیں گے اور اگر سارا محلہ بھی ٹھیک رہے مگر باہر سے بلوائی آ جائیں تو محلے والے کیا کر سکیں گے؟"

"نہیں۔ بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ پڑوسیوں اور محلے والوں نے جان پر کھیل کر مظلوموں کی جانیں بچائی ہیں۔" جنید بولا "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں یار۔" رؤف پھیکی ہنسی ہنسا ——— "مگر تم نے یہ کیسے طے کر لیا کہ یہ سب کچھ تمہاری ہی سمت ہو رہا ہے؟" شعار نے پوچھا۔ ——— "کیوں؟ یہ تم نے کیوں کہا؟" جنید چونکا۔

"اس لئے کہ آگ دور پر دکھائی دے رہی ہے اور پھیلی ہوئی ہے ایسے میں سمت کا اندازہ ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ کہ آگ پورب میں نہیں لگی ہے۔" جنید قدرے بے چین ہو گیا۔

"ہاں، یہ تو شعار صحیح کہہ رہا ہے۔ آگ کا رخ تو قدرے جنوب بھی ہے۔" افروز بولا۔

"ارے ... تو جنوب میں تو میرا گھر ہے۔" جنید تڑپ اٹھا۔

"نہیں، میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔" شعار نے بات سنبھالنی چاہی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب رؤف اور جنید دونوں کے دلوں میں شک نے گھر پکڑ اکہ آگ اُن کی سمت میں لگی ہے! دونوں مجمع میں گرفتار ہوئے ... اور ناصر کے معاملے میں سب ہی مجمعے میں گھرے ہوئے تھے کہ آخر اب تک وہ آیا کیوں نہیں۔

"یار ناصر کے معاملے میں ہم لوگ ابھی تک سنجیدہ نہیں ہیں۔" افروز کو پھر ناصر یاد آیا۔

"کیا مطلب؟" اعجاز چونکا۔

"مطلب یہ کہ..." افروز نے کہنا شروع کیا... "ہم ناصر کے بارے میں تشویش میں مبتلا ضرور ہیں مگر اس بات پر ہم نے اب تک غور نہیں کیا کہ آیا ناصر واقعی کسی مصیبت میں گرفتار ہوا، یا وہ کسی اور سمت نکل گیا۔"

"اب تم نے یہ ایک نیا پہلو پیدا کیا؟" اعجاز جھنجھلا گیا۔ اتنی بات تو صاف ہے کہ ناصر آگے بڑھ گیا تھا، اور آگے والے اسمبلی تک پہنچ کر میمورنڈم خود وزیر اعلیٰ کے حوالے کرنا چاہ رہے تھے یہ بھی طے ہے... پولس اپنی ضد پہ اڑی رہی اور مظاہرین اپنی بات پہ ڈٹے رہے، یہ بھی آنکھوں دیکھی بات ہے، جب پولس مظاہرین سے اپنی بات منوا نہ سکی تو اُس نے پہلو آنسو گیس چھوڑی اور پھر گولی چلا دی، اس کی گواہی بھی یہاں موجود ہر شخص دے سکتا ہے... پیچھے والے بھاگے، یہ بھی سب نے دیکھا... مگر آگے والوں کو بھاگنے کا بھی موقع کہاں ملا؟ اور ناصر آگے تھا۔ پھر وہ کسی اور سمت کیسے نکل سکا ہوگا؟" — "مگر ناصر کس مقام پہ ہم لوگوں سے الگ ہوا؟" شعار نے پوچھا۔

"ایں ... یہ کیا بات ہوئی؟ اعجاز چونکا۔

"یہی نہیں۔" جنید بولا۔ "سوال یہ بھی ہے کہ وہ کس مقام سے ہمارا رفیق ہوا؟"

"ارے ارے؟" اعجاز نے بوکھلا کر جنید کی طرف دیکھا۔

"بالکل صحیح سوال ہے۔" افروز بولا... جلوس جہاں سے شروع ہوا، وہاں سے تم ساتھ تھے پھر راہ میں جنید، رؤف، شعار اور میں، سبھی ساتھ ہوئے... مگر وہ کہاں سے ساتھ ہوا؟ یہ کسے یاد ہے؟" مجھے بھی بس اتنا یاد ہے" جنید نے حامی بھری "کہ شہید میموریل کے پاس جہاں مقررین نے تقریریں کی تھیں، اور جہاں پولس والوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تھی، وہاں ناصر بار بار نعرے لگا رہا تھا" — مگر اس سے پہلے وہ کہاں کہاں ہمارے ساتھ تھا؟ اور کس مقام پر ہم سے الگ ہوا؟ شعار نے خود کلامی کی۔ سب چپ رہے۔ کسی کو اس سے پہلے کی رفاقت اور آخری جدائی کا کوئی منظر یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔

"یارو! ہم بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" جنید کی آواز میں کراہ شامل تھی۔

"کیسی مصیبت؟" اعجاز ہنوز انجان بنا ہوا تھا۔

" اب ایک سوال اور سر اُٹھا رہا ہے ... وہ جو اُچھل اُچھل کر نعرے لگا رہا تھا وہ ناصر ہی تھا؟ اس کا کیا ثبوت ہے؟"

" لو ... لو ... اب یہ کیا فساد تیرے ذہن میں آیا مسٹنڈے؟" اعجاز بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ شعار ہنسا، افروز مسکرایا، جنید نے سر ہلایا ... اور اعجاز ناچ گیا۔

یہ سوال کیوں اُٹھا کہ وہ ناصر نہیں تھا۔ اعجاز کا لہجہ اب بہت تیکھا ہو گیا تھا۔

" اس لئے کہ یہاں سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ناصر آگے بڑھ چکا تھا تو پھر پیچھے سے نعرہ لگانے والا کون تھا۔؟" افروز نے کہا۔

" اور جنید کا کہنا ہے کہ وہ ہمارے پاس نعرہ لگا رہا تھا تو پھر آگے بڑھ جانے والا کون تھا؟" شعار احمد نے پوچھا۔

" نعرہ لگانے والا بھی ناصر نہیں، آگے بڑھنے والا بھی ناصر نہیں تو پھر ناصر کون تھا؟" اعجاز جھنجھلا گیا۔ " یہ تو تم بتاؤ گے اعجاز صاحب"! افروز بہت ہی تیکھے لہجے میں بولا۔ کیوں کہ وہ تم ہی تھے جو ہمیں اشارہ کر کر کے یہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنا یار ناصر نعرے لگا رہا ہے ... وہ آگے بڑھ رہا ہے ... سُنو سنو! پولس سے بحث کر رہا ہے ..."

" اور تم سب کی کوئی یاری ناصر سے نہیں تھی؟" اعجاز دانت کچکچا کر بولا۔

" مگر وہ ناصر ہمیں ملا کہاں جانی؟" رؤف بھی چپ نہ رہ سکا اور جھنجھلا کر بولا۔

" بس اب تو خدا ہی حافظ ہے ... شعار نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ دسمبر کی کٹکٹاتی سردیاں ... ہم کھلے میدان میں ... سامنے دالان موجود مگر وہاں جا نہیں سکتے ... چاروں طرف کرفیو براجمان سو ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے ... شہر میں گڑبڑ مگر کدھر پتہ نہیں ... آگ کے شعلے روشن مگر یہ کہنا مشکل کہ آگ کس طرف لگی ہے ... ناصر کا انتظار مگر یہ پتہ نہیں کہ یہ ناصر کون ہے؟ کب ملا؟ کب جدا ہوا اور ہمیں اُس کا انتظار کیوں ہے؟"

سب نے شعار احمد کی بات سنی اور سبھی کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہوئے مگر کہہ نہ سکے ...."

بس اعجاز اندر اندر تلملا رہا تھا مگر پتہ نہیں کس بات پر تلملا رہا تھا۔!

● ●

بارش میں گھر امکان

جل تھل گہرے سیاہ بادلوں کا ایک موسم میرے سینے پر آ کر ٹھہر گیا ہے۔ یہ موسم ! جو ازل اور ابد پر حاوی ہے ـــــ اس موسم کے انتظار میں کتنی آنکھیں لہو ہوئیں اور کتنے دل کشکول بنے !

پوچھنے والے مجھ سے اِس شہر کا اور اِس شہر میں مقدر میری پناہ گاہ کا حال پوچھتے ہیں اور میں جواب دینے کے بجائے اُن کے گھروں کے دروازوں اور دریچوں کی چلمنیں اُٹھا کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہوں تو ـــــ

تو یوں ہے کہ جل تھل گہرے سیاہ بادلوں کا ایک موسم میرے سینے پر آ کر ٹھہر گیا ہے ، اور یہ موسم کوئی نیا موسم نہیں ہے بلکہ میرا ورثہ ہے، مُردوں کی بات پسِ پشت ڈالیے ، خود جب میں گلی کے پہلے سرے پر پہنچا تو بارش نے آ لیا سوچا ، " اب کتنی دُور ہوں ، وہ سامنے ہی تو گھر ہے ۔ " مگر پہلا ہی قدم آگے بڑھایا تھا کہ چھپاک سے اپنے پیروں سے اڑا ہوا چھینٹا مجھے سرشار کر گیا ، اور دروازے تک پہنچتے پہنچتے میں سر سے پیر تک بھیگ چکا تھا۔ صاحب خانہ دروازے میں بچھی چوکی پر نماز پڑھ رہے تھے ، میں نے انتظار کیا کہ وہ فارغ ہو لیں ـــــ

——— دروازہ کبھی پختہ رہا ہوگا مگر اب تو جاتی بہاروں کا نوحہ خواں بن چکا تھا، جگہ جگہ سے اُکھڑا پلستر، دیمک لگی کنڈیاں اور جگہ جگہ سے رِستی چھت ——— چھت میں ہک کے ذریعہ لٹکنے والی لالٹین نے سیاہی کے اَمٹ رنگ ثبت کر دیئے تھے، طاقوں کی کگر ختم ہو چکی تھی، چوکی پر بچھی چادر تو دُھلی ہوئی اور صاف تھی مگر جب میں نے آہستہ سے چادر اُلٹی تو چادر کے نیچے کا فرش جگہ جگہ سے پھٹا ہوا نظر آیا ——— میں نے محسوس کیا کہ اگر اسے پھیلا دیا جائے تو عریانی اور پردہ پوشی کا درمیانی فاصلہ مٹ جائے، جائے نماز میں بھی جگہ جگہ پیوند لگا ہوا تھا اور طاق میں رکھے قرآن کا جزدان بھی، فرش اور جائے نماز کا ہم عصر معلوم ہو رہا تھا، چوکی کے نیچے ڈھیر ساری گندگی اور کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا، سامنے سیڑھی کا تہ خانہ تھا۔ جس میں پھٹے پُرانے جوتے اور مہترانی کو گندگی اُٹھانے کے لیے دی جانے والی راکھ جمع نظر آئی۔

صاحبِ خانہ نے جلدی ہی نماز ختم کر لی۔

اور دونوں طرف سے آنے والی بارش کی بوچھار سے بچانے کے لیے مجھے لیے ہوئے اندر چلے گئے۔

صاحبِ خانہ (کہ وہ میرے دوست بھی تھے، اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی، نابغہ بھی، اور اپنے عہدِ شباب کے "آزاد خیال" فرد) نے مجھے اندر لے جانے سے پہلے پردہ کرایا اور پھر مجھے لیے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

نہایت چھوٹا سا گھر تھا، جس کے تین بھائی حصّہ دار تھے، اور ہر بھائی کے حصے میں ایک ایک کمرہ آیا تھا، میرے میزبان کا کمرہ (جو دراصل میرے میزبان کے والد کے حصے کا تھا) کمرہ نہیں بلکہ اچھا خاصا کباڑ خانہ تھا ——— دیواروں پر

مذہبی طغرے، اجنتا اور ایلورا کے فن نقاشی کے بہترین نمونے، ماڈرن آرٹ کے شہ پارے، میرے میزبان کے بی، اے، ایم اے کے کو نو وکیشن کی تصویریں سب کچھ شانہ بہ شانہ باعثِ رونقِ خلوت تھیں۔ ایک جانب ڈھیر سارے پُرانے بکسوں کا ڈھیر تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب اُن کی والدہ کو جہیز میں ملا تھا۔ جن کے والد انگریزوں کے زمانے میں پولیس انسپکٹر تھے، طاقوں پر بیک وقت پُرانی شیشیوں کا انبار، ٹوٹا ہوا چھوٹا سا آئینہ، میلی میلی کنگھیاں، پونڈس اور لیکمے اِسنو اور پاؤڈر، کول گیٹ کا ٹوتھ پیسٹ اور شیونگ کریم، سب کچھ جمع تھا، کچی زمین کے ایک کونے میں دو گھڑے رکھے ہوئے تھے اور ٹیبل پر سب سے چھوٹے لڑکے کی کتابیں، اُسی سے لگی ہوئی ایک دیمک زدہ بنچ جو بیک وقت کرسی کا کام بھی دیتی تھی اور لوٹا بالٹی رکھنے کے بھی کام آتی تھی اور بچوں بیچ ایک چارپائی۔ جس پر صاحبِ خانہ سوتے تھے۔ ــــ "آیئے اوپر چلا جائے ــــ" کچھ دیر بعد جب میں نے بدن پونچھ لیا اور اُنھوں نے بھی غالباً اوپر ٹھہری عورتوں کو دوسرے بھائیوں کے کمرے میں بھیج دیا تو کہا۔

"ہاں چلئے۔ میں بھی گھٹن محسوس کر رہا ہوں۔"

اوپر پہنچنے پر اُس ٹھک ٹھک کا راز کھُلا جو اتنی دیر سے میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ صاحب خانہ کے والد ہتھوڑی، کیل اور ٹین کا پترّ لیے جگہ جگہ چھپّر میں "چپّی" دے رہے تھے۔

اوپر ــــ کمرے کا دروازہ چوکھٹ سے بے نیاز تھا، اور آثارِ قدیمہ کا بیش قیمت سرمایہ، کمرے کا فرش اور دیوار کبھی پختہ رہا ہوگا لیکن اب تو اس کی حالت دروازے سے بھی بدتر تھی۔ کمرے میں تین چارپائیاں بچھی

ہوئی تھیں، معلوم ہوا کہ ایک پر صاحبِ خانہ کے والد، ایک پر والدہ، اور ایک پر چھوٹا بھائی سوتا ہے ——— چھوٹے بھائی کے بستر پر نصابی کتابوں کے علاوہ روسو کی "اعترافات"، سارتر اور کامیو کی تخلیقات، اور کچھ البرڈ ڈرامے رکھے ہوئے تھے، والد کی پلنگ کے پاس والے طاق پر تسبیح، تیمم کی مٹی، بہت سارے تعویذ اور گنڈے اور ان کے والد کے زمانے کی ایک کاپی رکھی ہوئی تھی۔ جس میں خاندان کا نسب نامہ، ہر مرض کی دعا اور مجرب نسخے درج تھے۔

کمرے کی تین دیواروں میں پرانے طرز کی بے کواڑ کی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں بڑی بڑی کتابیں سجی ہوئی تھیں، اوپر دیکھا تو کھونٹیوں پر بھی کتابیں ہی کتابیں تھیں، ایک سمت جدھر الماری نہیں تھی، تین کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جن سے شاید کبھی ٹھنڈی ہوا اور بارش کی پھوار آجاتی ہو، ایک دروازہ جو چھت پر کھلتا تھا بند تھا، میں نے کھولنا چاہا تو قبضے سمیت دیوار سے نکل آیا۔ مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی، میں نے سمجھا شاید میں نے ہی توڑ دیا لیکن صاحبِ خانہ نے یہ کہہ کر میری شرمندگی کچھ کم کر دی کہ "یہ پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا ہے۔"

"اسے کھول کیوں نہیں دیتے؟" مجھے گرمی لگ رہی تھی۔

"چھت پر سے آنے والے پانی کا ریلا کمرے کو ندی بنا دے گا ———"

میرے میزبان نے ہنس کر کہا۔ میں خاموش ہو گیا۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

بارش کا زور ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا، چاروں طرف گہرے سیاہ بادل روشنیوں کا رستہ روکے کھڑے تھے، شب کا پہلا پہر تھا۔ مگر اتنا

اندھیرا تھا کہ گھڑی میں وقت دیکھنا چاہا تو دھندلکوں اور اندھیروں نے وقت کو تاریکی کے دبیز پردوں میں چھپا دیا، صاحبِ خانہ کے عمر رسیدہ والد نے کھڑکیاں بھی بند کر رکھی تھیں، بس آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ بارش کتنی شدید ہے، ہوائیں بار بار دیواروں اور کھڑکیوں سے سر ٹکرا کر ہہ ہہ کی آواز پیدا کرتی ہوئی لوٹ جاتی تھیں، بارش ٹپ ٹپ نہیں بلکہ ٹھائیں ٹھائیں ہو رہی تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سرحدوں پر جنگ کی بھٹی سلگ گئی ہے اور دونوں جانب سے فوجیں مشین گنوں اور ٹامی گنوں سے فائرنگ کر رہی ہوں۔ بیچ بیچ میں بادل اتنے زور سے گرجتا جیسے ہیروشیما تباہ کیا جا رہا ہو۔ کبھی کبھی جب بجلی بہت زور سے چمکتی تو لالٹین کی روشنی مدھم پڑ جاتی اور کمرے میں رکھے ہوئے چہرے عجیب سے لگتے ——

کوئی سحر تھا جس کے ہم سب قیدی تھے، ہم باتیں بہت کم اور ایک دوسرے کو دیکھ زیادہ رہے تھے، جیسے ہم سب اجنبی ہوں اور ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میرے میزبانوں کے چہروں پر رنگوں کی بوچھار پڑ رہی تھی، میں نے آتے جاتے رنگوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا چاہا تو آتی بہاروں اور جاتی بہاروں کا خیال آیا ——

صاحبِ خانہ کے والد کی شخصیت اپنی جگہ مکمل بھی تھی اور نامکمل بھی۔ گھٹیوں کو چھوتا ہوا کرتا، سپید تہمد، لمبی داڑھی، چوگوشیہ کلاہ، جھرّی دار پُرنور چہرہ، آنکھوں میں سینکڑوں تربتوں کے کتبے اور ہاتھوں میں ہتھوڑی، کیل اور ٹین کا پترّ —— وہ ہمارے وجود سے بے خبر جگہ جگہ سے رِستی چھتّ کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، چھتّ

مکمل طور سے مائل بہ خستگی ـــــ اس کی تعمیر تقریباً چالیس سال قبل ضرور ہوئی ہوگی اور پچھلے پچیس برسوں سے اس کا زوال شروع ہو چکا تھا، ہر سال اُس کی مرمت ہوتی اور ہر سال وہ خستگی اور شکستگی کا استعارہ بنتی، مگر مرد پیر ہر لمحہ اس کی حفاظت پر کمربستہ رہتے تھے۔ گول تڑخ تڑخ گئی تھی، بانس میں دیمکوں نے آشیانہ بنالیا تھا، جگہ جگہ سے بانس گول کی راکھ بُھر بُھرا، بُھر بُھرا کر گر رہی تھی ـــــ اور صاحب خانہ کے والد جگہ جگہ سے اُسے سہارا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یوں کتنے دنوں تک اِسے بچایا جاسکے گا؟" میں نے آہستہ سے صاحب خانہ سے پوچھا۔

لیکن والد نے بھی سُن لیا۔ انھوں نے دھیرے دھیرے گردن گھمائی، اور پھر عجب پُراسرار انداز میں میری جانب دیکھ کر مسکرائے، آنکھوں میں عجب رنگ لہرانے لگے، اُس لمحے ان کی آنکھیں عجب ہوگئیں، مجھے احساس ہوا جیسے ان آنکھوں میں اتھاہ دشاؤں کا سمندر دفن ہے ـــــ دشائیں جو ایک دوسرے سے ٹکرا کر چُور چُور ہو جاتی ہیں۔

میں ان سے آنکھیں نہ ملا سکا اور دھیرے سے نظریں جُھکالیں۔

"ہاں۔ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" صاحب خانہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا "نیچے کی دیواریں بھی کچی ہیں۔ اور ان کی جڑوں میں بھی لونا لگنے لگا ہے، سوچتا ہوں پُشتے دِلوادوں، چھپر کے بھی کچھ گول بانس بدلنے ہوں گے۔"

"لعنت ہے اِس مکان پر ـــــ" صاحب خانہ کا چھوٹا بھائی جو لالٹین کے آگے سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا، جھلا کر بولا "گر جانے دیجیے کم بخت کو،

"کتابیں تو بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔" میں نے الماریوں کی طرف دیکھ کر کہا جن میں ہر کتاب کاغذ میں لپٹی اور دھاگے سے بندھی رکھی تھی۔

"ہاں، یہ سب تو ابّا کی کتابیں ہیں۔" صاحب خانہ بتلانے لگے ــــ "ساری کی ساری عربی فارسی میں ہیں، ہم لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے اور ابّا کی آنکھیں ہی کمزور ہو گئی ہیں، ایک دن کتابیں اُٹھا کر یوں ہی دیکھنا شروع کیا تو دیکھا کہ بہت سی کتابوں میں دیمک لگنے لگی ہے اور جن میں دیمک نہیں بھی لگی ہے اُس کی جلد بالکل ہی خستہ ہو گئی ہے۔ اِس لیے سب کو کاغذ میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ موقع مل گیا تو جلد لگوا کر کسی قومی لائبریری کو دے دوں گا۔"

"چہ ــــ فضول کتابوں سے کیا فائدہ؟" صاحبِ خانہ کا چھوٹا بھائی پھر جھلّا کر بول اُٹھا ــ "میں تو کہتا ہوں ایسے ہی کسی لائبریری کو دے دیجیے، میری کتنی کتابیں یوں ہی ٹیبل پر پڑی ہیں ان الماریوں میں آجائیں گی، پھر جن پیسوں سے ان میں جلد لگوائی جائے گی اُن سے دوسری کام کی کتابیں آسکتی ہیں۔"

میرے میزبان کے والد کے ہاتھ رک گئے، جیسے سکتہ لگ گیا ہو، بہت دیر تک کھوئے کھوئے اوپر، خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کرتے رہے، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی کسی آواز کو سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر سرگوشی کے انداز میں چھوٹے کی طرف دیکھ کر بولے ــ "بس اب کام ختم ہی سمجھو۔ رات بھی گہری ہوتی جا رہی ہے۔ حبس بھی بہت ہے۔ دروازہ کھلے تو شاید ہوا آئے۔ ــــــ"

"دروازہ کھول دوں ابّا؟" صاحبِ خانہ نے دروازہ کھولنا چاہا۔

"نہیں رہنے دو۔" اُنھوں نے ہاتھ سے منع کیا۔

"ابھی آپ نے کہا دروازہ کھولنے کو، اب منع کر رہے ہیں ـــ آپ ابّا بالکل بوڑھے ہو گئے ہیں ـــــ" چھوٹا بھائی منہ بنا کر بولا۔

"ہاں بیٹا! بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔" اُنھوں نے پھر مسکرا کر دھیمے لہجے میں کہا۔

ہم باتیں کرتے کرتے اپنے بستروں پر آ گئے۔

میرے میزبان میرے ہی بستر پر تھے، کیوں کہ نیچے کے کمرے میں اُن کی ماں اور بہن ایک ہی بستر پر ہوں گی ـــــــ

میں نے باہر کی طرف کان لگایا تو بارش کے زور میں ذرا بھی کمی کا اندازہ نہیں ہوا۔ وہی ہَوا کی ہَہ ہَہ ـــ سائیں سائیں ـــــ بارش کی پُرزور آواز۔ بادل کی دل دوز گرج ـ اور ان کے درمیان ـــــ گھرے ہوئے ایک مکان میں ہم سب ـــــــ

دھڑ ڑڑ ڑام ـــــ اچانک ایک بھیانک آواز اُبھری اور میں چونک کر اُچھل پڑا۔ لیکن میرے میزبان اطمینان سے لیٹے رہے اور مسکراتے رہے۔

"گھبراؤ نہیں۔ کسی حصّے کی دیوار کی اوپری پرت گری ہو گی۔"

"تو دیوار کو بھی تو خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"ہا ہا ہا ہا ـــ" صاحبِ خانہ کا چھوٹا بھائی قہقہہ مار کر ہنسا۔ "آپ ڈر گئے؟ پچیس تیس برس سے برابر دیوار کا کوئی حصّہ ہر لمحہ ڈھ رہا ہے لیکن دیوار آج تک نہیں گری۔"

میں نے اچانک چمکنے والی بجلی کی روشنی میں گھڑی دیکھی تو بے چینی اور

بڑھ گئی ——— ابھی تو آدھی رات بھی نہیں گذری معبود!

میرے میزبانوں کو نیند آتی گئی اور تھوڑی دیر بعد تینوں کے خرّاٹے گونجنے لگے۔

سب سو رہے ہیں ———

گہری سیاہ اندھیری اور خوفناک رات چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

اور سب سو رہے ہیں — سب سو رہے ہیں اور میں جاگ رہا ہوں ———

میں جاگ رہا ہوں — کروٹ پر کروٹ بدل رہا ہوں ——— رات گہری ہوتی جا رہی ہے، پھر بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے — میں جاگ رہا ہوں مسلسل جاگ رہا ہوں ———

آہستہ سے اُٹھتا ہوں، کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر دیکھتا ہوں۔ بارش کا وہی زور ہے — وہی طوفان — وہی گرج — وہی ہوا کا زور۔ اور جہاں تک نظر دوڑاتا ہوں، وہی بارش — وہی مکان — وہی بارش — وہی مکان وہی بارش، وہی مکان ———

جل تھل گہرے سیاہ بادلوں کا ایک موسم میرے سینے پر آکر ٹھہر گیا ہے! یہ موسم جو ازل اور ابد پر حاوی ہے۔ اِس موسم کے انتظار میں کتنی آنکھیں لہو ہوئیں اور کتنے دل کشکول بنے!! ——— پوچھنے والے مجھ سے اِس شہر کا، اور اس شہر میں مقدر میری پناہ گاہ کا حال پوچھتے ہیں اور میں جواب دینے کے بجائے اُن کے گھروں کے دروازوں اور دریچوں کی چلمنیں اُٹھا کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہوں تو — تو سبھی اپنے دروازوں اور دریچوں کو پٹاپٹ بند کرنے لگے"

ہیں ——— !!!

●●

بہ اُمید آں کہ روزے

بارش دھواں دھار ہو رہی ہے ——

کمرے میں پنکھا اپنی پوری رفتار سے گھوم رہا ہے، بیڈ لیمپ کی ہلکی آرام دہ روشنی میں کمرے کا سارا منظر طلسمی اور رومانی بنا ہوا ہے، میرے اور نشاط کے کپڑے عطر میں بسے ہوئے ہیں، خوب صورت بیڈ شیٹ پر ہم دونوں لیٹے ہوئے ہیں۔

نشاط رومانی موڈ میں ہیں۔

اور مجھے اپنے موڈ کی خبر نہیں۔

مجھے خود اپنی خبر نہیں کہ میں کہاں ہوں ؟ میں ہوں بھی یا نہیں ؟

نشاط بار بار مجھے اپنی جانب متوجہ کر رہی ہیں اور میں بار بار گڑبڑا جا رہا ہوں۔ اس اژدہام میں اُنھیں پہلو کیسے کروں ؟

یہ اژدہام بھی میرے ارد گرد تھا۔

جب میں اور میرے دوست چندن تن شہید کی پہاڑی پر واقع دائیں جانب کی دوالان میں کوئلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے اپنے نام لکھا کرتے، کتنی ہی زبردست بارش ہو، ہوائیں چلیں، طوفان آئیں وہ نام مٹتے نہیں تھے،

کتنی برساتیں آتیں اور گزر جاتیں اور نام اُسی طرح جگمگاتے رہتے، چھر پاہی کے جھرنوں میں لوٹ لوٹ کر نہاتے ہوئے ہم دنیا کے سارے دُکھوں سے بے پروا ہو جاتے اور ایسے مزے لے لے کر کباب اور حلوے کھاتے، گویا آسمان سے من و سلویٰ اُتر گیا ہو، مدرسہ کی بورڈنگ میں ہم سب عجیب عجیب مزے کرتے، فضلو میاں داروغہ مطبخ تھے اور اپنے رنگ میں منفرد اور یکتا فرد ... ناک سے بولتے تھے، بلکہ بولتے کم تھے اور ممیاتے زیادہ تھے اور اسی طرح ممیاتے ممیاتے اشعار بھی پڑھا کرتے ... کبھی کبھی مذہبیت جب کچھ زیادہ سوار ہو جاتی تو ناک سے ممیاتے اور شوں شوں کرتے نعت پڑھتے ؎

رسولِ خدا سے ہے زاری ہماری
کہ محشر میں ہو وے نہ خواری ہماری

بورڈنگ میں خوب خوب گپیں ہوتیں ... اسحاق، رزاق، مظاہر، شمیم، ضیا، فرید اور جانے کون کون گھنٹوں بلاوجہ بحث و تکرار کرتے، ہفتہ واری جلسے ہوتے اور ہم سب رٹی رٹائی نعتیں اور تقریریں سُناتے اور ذرا سی غلطی پر جمعیۃ الطلبار کے صدر عباس بھائی مرحوم کی گھڑکیاں سہتے۔

نانی اماں کے بڑے بڑے آنگنوں، دالانوں اور کمروں میں ہم سب دوڑتے رہتے، توت والے حصّے میں آپی شفقت اور آپا نزہت کے ساتھ اِکّی دُکّی کھیلتے اور جب یہ دونوں جیتنے لگتیں تو میں سنگھی مار کر گرا دیتا ... اور صبح سویرے نانا میاں سے سب سے پہلے اُٹھنے پر انعام لینے کے لیے اُٹھتے ہی ننگے دھڑنگ نانا میاں کی باہری رہائش گاہ کی طرف دوڑ پڑتا اور نانا میاں فوراً اُلٹے پیر واپس کرتے کہ "منھ ہاتھ دھو کر، کپڑا پہن کر آؤ"۔

GIFT OF URDU LIBRARY, PATNA

اور اسی بیچ آپی فرسٹ ہو جاتیں ... نانی اماں کونڈے کا فاتحہ کرتیں، نانا میاں سفید بھک چادر پر رکھی پوریوں کے قریب بیٹھ کر داستانِ عجیب حضرت امام جعفر صادقؑ پڑھتے ... شبِ برات میں میرے نانی ہالی محلے املی آدم خاں میں گول دغتی اور شہر کے مختلف محلے والے یہاں آکر آتش بازیوں کا مقابلہ کرتے۔ ... محرم میں نانا میاں کے گھر کے بالکل سامنے قوالوں کے چوک پر براق بیٹھتی اور محلے کے چوک سے تعزیہ اُٹھنے سے پہلے "لاٹھی پاٹھی" کھیلی جاتی، پورا محلہ میرے نانی ہال سے آیا شربت پی کر تازہ دم ہوتا، محلے کے خلیفہ طاہر نعرۂ حیدری بلند کرتے اور تعزیئے، بلّموں، برچھیوں اور نیزوں کے سائے میں گشت کے لیے روانہ ہوتے اور ہوا کے دوش پہ نعرے گونجتے ... حسینؑ ..... حسینؑ ..... امام حسینؑ ....

میرے محلّے اور گھر میں بھی محرم کے دِنوں میں بڑی رونق رہتی، سب رشتہ دار جمع ہو جاتے، تین چار محرم کو ہم لوگوں کے دادا کے نانا حضرت مولانا فریدالدین فریدثانی کا عرس ہوتا، اِس موقع پر اورنگ آباد سے میرے بھائی اور دوست حلیم اور ہاشم آجاتے اور ہم سب مل کر اپنے ایک نازک مزاج بھائی کو مسلسل چڑاتے اور نوبت جب مار پیٹ تک پہنچتی تو معافی مانگ لیتے۔

پانچ تاریخ کو مٹی لانے جاتے ہوئے جب ہماری پیشانیوں پر ٹھنڈا ٹھنڈا صندل لگتا تو ہم محسوس کرتے کہ جہاد کے لیے جا رہے ہیں اور پھر پہلے ہی دن کے جلوس میں ہم اس قدر چیخ لیتے کہ نویں دسویں کے جلوس میں گلا بیٹھا بیٹھا محسوس ہوتا لیکن پھر بھی پتہ نہیں کہاں سے ہماری آواز میں طاقت آجاتی، اور خاص طور پر جب کسی دوسرے محلے کا جلوس سامنے آجاتا تو ہم دل ہی

دل میں کسی خدائی طاقت کا اِحساس کرتے ... فلاں جلوس ہم سے آگے نہیں جائے گا ... ہم راستہ نہیں دیں گے ... یا حسینؑ ... یا علیؑ ... کربلائے معلّٰی کے جلال کی خاک ہماری آوازوں میں شامل ہو جاتی ... حضرت امام کی عقیدت سے ہمارے چہرے سُرخ ہو جاتے، ہماری شریانوں میں گرم گرم لہو سرسرانے لگتا ... اور جب نویں کا جلوس اپنا گشت مکمل کر کے دس محرم کی دوپہر میں محلے کے موڑ پر پہنچتا تو محلے کے بزرگ کہاروں کو ہٹا کر تعزیہ اپنے کاندھوں پر لے لیتے اور ہم لوگ مرثیہ پڑھتے ؎

جنگل سے آئی فاطمہ زہراؑ کی یہ صدا
اُمّت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمّدا

تو میدان، گلی، چوکھٹ، آنگن، مرد، عورت ... ذرّے ذرّے سے سسکیوں اور آہ و بکا میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھرتی ... حسینؑ .... حسینؑ ... حسینؑ اور جب دسویں کے آخری جلوس کے ساتھ ہم فرضی کربلا تک پہنچتے تو مرثیہ پڑھتے پڑھتے ہمارے گلے رُندھ جاتے اور جذبات کی شدت سے کوئی چیخ کر پڑھتا ع دفناؤ تعزیوں کو کہ عشرہ گزر گیا

پھر جب ہم تعزیئے دفن کر کے محلے پہنچتے تو ماحول واقعی کچھ ایسا ہو جاتا کہ جیسے ہم کسی عزیز کو دفنا کر آئے ہوں ... آنکھیں سُرخ ... جگی جگی سی ... ہم سوتے اور دس بارہ گھنٹے مسلسل سوئے رہتے .... اُن دنوں تو یوں بھی نیندیں صف بنا بنا کر میرے حضور ہاتھ جوڑے کھڑی رہتی تھیں اور میں جب چاہتا نیند کی کسی لہر کے ساتھ بہتا تیرتا خوابوں کے دُور دیس کا سفر پل بھر میں طے کر آتا۔ مگر اب نیند سے میری دشمنی ہے، سوتے میں بھی جاگتا رہتا ہوں، نشاط

کہتی ہیں کہ آپ کو ذرا سا چھوتی ہوں تو آپ جاگ پڑتے ہیں .... اور اگر کبھی نیند آتی بھی ہے تو آدھی ادھوری رہتی ہے ... بے خواب ...

ہاں ... اب نیند آتی بھی ہے تو خواب نہیں آتے ... پہلے میں خوابوں کے سہارے جاگتا تھا اور خوابوں کے سائے میں سوتا تھا اور ملکۂ ہفت بر اں اپنے تختِ طلسمی پر مجھے بٹھائے ہفت خواں کی سیر کراتی تھی مگر اب مجھے کوئی پری اُٹھا کر اپنے جادوئی کھٹولے پر نہیں بٹھاتی۔

مَیں جاگتا رہتا ہوں۔ جاڑے اور برسات کی رومانی راتوں میں بھی دو دو بجے رات تک جاگتا رہتا ہوں ... کبھی کبھی جاگتا اُس وقت بھی تھا مگر اُس وقت جاگنے کی لذت کچھ اور ہوتی تھی ... برسات کی راتوں میں ابا، اماں، عین اور مَیں، کوٹھے پر دیر تک باتیں کرتے رہتے، بادل خوب زور سے گرجتا، اور جب پانی بہت زوروں سے برسنے لگتا تو چھپر کہیں کہیں سے ٹپکنے لگتی اور ہم چارپائی وہاں سے کِھسکا کر دوسری جگہ کر لیتے اور پھر باتوں میں مصروف ہو جاتے ...

وجود کے مختلف مظاہر کا مسئلہ، کائنات اور اشیاء و مظاہر کے حدوث و فنا کی بحث، ذاتِ باری واجب الوجود ہے اور صفاتِ باری ممکن الوجود تو ممکن واجب کا عین ہے یا ظل؟ یہاں سے بات وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی طرف مڑتی اور پھر جبر و قدر، بقا و فنا، خیر و شر دُنیا جہان کے مسائل زیرِ بحث آتے اور بحث کرتے کرتے اچانک خیال آتا کہ عین خرّاٹے بھرنے لگا... اماں بے خبر ہو گئیں ... تو گھڑی پر نظر پڑتی ... "سوؤ۔ سوؤ ... تین بج رہے ہیں۔" ابا کہتے۔

میں آنکھیں بند کر لیتا مگر پھر بھی سوالات کی کرچیاں آنکھوں میں چبھتی رہتیں ... اور موسم باراں کی انتہائی شدید بارانی راتوں میں چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیارا چھایا رہتا ... بادل ٹوٹ ٹوٹ کے برستا رہتا ... بارش کی زوردار بوچھاڑیں کمرے تک پہنچتی رہتیں، آس پاس کے "کچے" مکانات کی "کچی" دیواریں بہہ بہہ کر کے ڈھتی رہتیں اور اس ساری پُراسراریت اور بھیانک پن کے درمیان ابا کی آواز گونجتی رہتی۔ "یا اللہ ... یا رحمٰن ... یا رحیم ... یا حی ... یا قیوم۔"

حی و قائم خدا ہم پر سایہ کیے رہتا، اور ہم دُور دُور تک قطار لگائے خوابوں کے سحر میں گرفتار رہتے اور مصر کے پیرامِڈس پر چھائی راتوں کے اسرار اور خموشی جیسی اور شانے پر ہاتھ رکھے کوئی قلوپطرہ بالکل شیمی جیسی اُن اندھیری، پُراسرار اور شرابور راتوں میں غرارہ پہنے ... بادلوں میں ... آسمانوں پر ... میرے آنگن کے بیچوں بیچ ... کوٹھے پہ ہماری چارپائیوں کے درمیان ... پھرر، پھرر کرتی چلتی ... اور جب ایسا ہوتا تو بادل کی گرج اور بڑھ جاتی اور بارش اور تیز ہو جاتی ...

اُن دنوں نہ میں پڑھا یونی ورسٹی کا طالب علم تھا اور نہ میرے اندر علم و ادب کا کوئی خاص شعور تھا، میں بہت چھوٹا تھا ... اور شیمی بھی ... لیکن جب بھی ہم ایک دوسرے کے قریب آتے تو پتہ نہیں کس چیز کے خوف سے ایک دوسرے کو ٹھیک سے دیکھتے بھی نہیں ... اور تب میں رات میں اپنی کاپیوں پر جگہ جگہ لکھتا، شیمی ... شیمی ... پھر کھرچ کھرچ کر مٹا دیتا ——

پھر دُرگا پوجا آتی تو میں اور مہیش آوارہ گردی کرتے اور ایسے میں مینا کشی نظر آجاتی تو ایسا لگتا جیسے شام کے وقت کوئی چرواہی اپنے گلّے ہنکاتی خموش اور پُرسکون وادیوں سے گذر رہی ہے۔ جیسے کوئی بنجارہ اپنے اکتارے پر ہجر میں ڈوبے کسی بے نام سُر کے سحر میں خود گرفتار ہو اور پھر اُس سر کو پیکر مل جائے اور وہ پیکر... دودھیا پیکر ... ہواؤں، ندیوں اور سبزہ زاروں پر تیرتا اور سویا سویا چلتا ہمارے قریب سے گذر رہا ہو ... اور ہم بے مقصد گھومتے رہتے اور چہروں کی تراش اور آنکھوں کے انعکاس کی بازیافت میں مصروف رہتے۔

پھر دُرگا پوجا گذر جاتی۔

دن بے کیف سے ہونے لگتے۔

کہ اچانک کسی صبح کوئی میری چادر کھینچ کر یا میرے کانوں میں کاغذ کی بتّیاں ڈال کر مجھے جگاتا۔ میں جھلا کر آنکھ کھولتا تو ایک لڑکا مُسکرا کر آداب کرتا۔

"ارے تم ڈاکٹر؟ کب آئے؟

"بس ابھی آیا... سامان رکھا اور آپ کے پاس چلا آرہا ہوں۔"

اور پھر وہ شروع ہو جاتا۔

"آپ نے ابن صفی کا نیا ناول "ڈیڑھ متوالے" پڑھا بھیّا؟ ــــــ بائی گاڈ کیا گریٹ ناول لکھا ہے سالے نے؟ ہمبگ دی گریٹ کا کیا کیریکٹرائزیشن ہے؟ ــــــ آپ نے جو افسانہ ٹھیک کیا تھا؟ وہ "زیور" میں چھپ گیا۔ ہم لوگوں نے رانچی میں اس مرتبہ پٹنہ کی طرح میلاد کیا۔ سبھی میڈیکوز نے حصّہ لیا۔ دھنباد میں اُن کے بابا حضرت کا بڑا اچھا خاصا رپوٹیشن ہے۔ خود محترمہ بھی بہت واری فدا نظر آرہی ہیں ... مگر یہ کاغذی پیکر کچھ جچتے نہیں بھیّا ــــــ

میں اپنے آپ میں جتنا مجبور ہوتا جا رہا ہوں وہ اپنے آپ میں اُتنی ہی مغرور ہوتی جا رہی ہے ... بات کیا کروں ... خاک پتھر؟ اُس کے بابا ٹھہرے رانچی یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین ـــــ سالی کار پہ آتی ہے، کار پہ جاتی ہے۔"

پھر وہ لڑکا گنگناتا "زندگی ـ اک سفر ـ ہے سُہانا ـ آ ـ آ ـ"

پھر قہقہہ لگاتا اور کہتا "ہنسیے بھیا ـ ہنسیے ـ زندگی کا کوئی ٹھکانہ ہے جانے کہاں پر دھوکا دے جائے۔"

پھر بیٹھے بیٹھے چپ سا ہو جاتا ـــ پھر کچھ دیر بعد ـــ ہولے ہولے گنگناتا ـــ کبھی الوداع نہ کہنا ـــــ

پھر وہ کھلنڈرا ڈاکر چلا جاتا اور زندگی پر اُداسی کے سائے تیرنے لگتے۔ کہ اچانک خبر ملتی "شیمی آئی ہے۔"

میں مضطرب سا ہو جاتا، اُس کے گھر پہنچتا، وہ کسی کونے کھدرے میں کھڑی بیٹھی ملتی، میں اُسے دیکھتا، خواہش ہوتی ڈھیر ساری۔ وہ شاکی یا شاید خوش نظروں سے مجھے دیکھتی ... اور میں کبھی بہت خوش، کبھی بہت اُداس واپس چلا آتا اور گھر آکر ڈائری میں لکھتا ... "میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا ـــــ وہ میرے خوابوں کی منزل ہے ـــــ میرے سفر کی معراج، اور میرا ماحصل" ـــــ شاموں کو میں تنہا ہی نکل جاتا اور یونہی کسی گلی، کسی سڑک پر چکر کاٹتا رہتا۔ کوئی شعر گنگناتا، کوئی خواب دیکھتا کہ اچانک کوئی آکر کان میں کہتا ـــــ سارے تعزیئے نکل چکے، میل کا وقت آگیا ـــــ وہ بھور کا سمے ہوتا ـــــ بڑا سہانا اور جان لیوا ـــــ میل کے مقام پہ دونوں صدر مجرد ہوتے، ہم بہت سے ساتھیوں کا غول پہنچتا۔

ہو ہا کرتا ہوا، میل ہوتا رہتا اور ہم تعزیوں کی گنبدیں دیکھنے کے بہانے چھتوں اور بالا ریزوں پر ٹکے چاند دیکھتے۔

یہ اُس سفر کی داستان ہے جو ہجر اور دُکھ کے لمحوں سے روشن ہے اور ہم ہمیں، اُن پُرکھوں نے سونپا ہے جو ہم سے کہیں زیادہ ہجر اور دُکھ سے آشنا تھے۔ ہماری ہجرتوں اور المناکیوں کے امیر کارواں قاضی علی حق —— جو تاعُمر صبر کی تھکن سے چُور چُور رہے! قاضی علی حق —— ۱۸۵۷ء کا گمنام سپاہی جس نے انگریزوں کے خلاف کنور سنگھ کا ساتھ دیا۔

جو حویلی سے باہر نکلتا تو ہر قدم کے لیے زمین پوچھی جاتی اور اپنی مٹی سے لمحۂ ہجر کی آشنائی کے سبب جس کے پاس صرف بیل گاڑی پہ لدا کھانے کا برتن اُس کی بیوی اور اُس کا بیٹا وحید الحق موجود تھا۔ —— اللہ بس باقی ہوس!

قاضی وحید الحق بھی ساری زندگی آمد اری کے ہجر میں تڑپتے رہے، اور بالآخر چین نہ پایا تو بنارس کی دہلیز پہ سر رکھا اور سو گئے اور اپنے بعد دو بیٹے، ہجر کی تڑپن اور محبت کی جلن برداشت کرنے کے لیے چھوڑ گئے —— الحاج واعظ الحق مسرور سہسرامی اور حضرت حافظ وصی الحق مسکین سہسرامی۔

مسرور سہسرامی تم اورنگ آبادی نام کے مسرور تھے مگر زندگی بھر مضطرب رہے اور وجود کے اندر ٹھاٹھیں مارتے بےچینی، اضطراب اور ہجر کے سمندر میں اُبھرتے ڈوبتے رہے اور مسکین سہسرامی صبر کے نشے سے سرشار ہو "الفقر فخری" کی مسند پر ٹکے رہے اور اپنے جوان بیٹے، بیٹیوں کی موت پر اتھاہ اُداسی بھری آشنا نگاہوں سے خلاؤں کی جانب تکا کیے اور انتقال کے وقت سارے شہر کو اپنی چوکھٹ پہ جمع کر لیا اور حاکمِ وقت کو زار زار رونے پر مجبور کر دیا۔

ع آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

لیکن شاید یہ شبنم افشانی کا موسم نہیں ہے۔

بارش پل بھر کو بھی کم نہیں ہوئی ہے ——— رات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے ——— نیند، بچھڑے محبوب کی تمثیل ہے ———

پس میں جاگ رہا ہوں۔ ———

میں جاگ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ہجرتوں کے اس سارے تسلسل میں میرے اِس حقیر سے وجود کی اہمیت کیا ہے ——— میں! ——— جس کے لمحے کبھی کائنات پر حاوی ہو جاتے ہیں اور کبھی اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ ساری پہچان کھو جاتی ہے اور سارا سفر ناکام اور بے مُراد رہ جاتا ہے... میں! ایک انتہائی معمولی قصبہ گو جس کے شہر کی صبحیں اور شامیں گرمیاں، سردیاں اور برساتیں اُس کے سینے پر صبا نما اُترتی تھیں اور اُس کے ہر ہر سانس میں اپنی ساری شیتلتا کو ملتا اور مدھرتا کے ساتھ بڑا چھان رہتی تھیں۔ جس کے سارے لمحے بڑے ہی خواب آلود اور بڑے ہی فینٹاسٹک تھے۔ جس کے پُرکھے اِس شہر سہسرام میں ہجرت کا دُکھ لے کر آئے تھے اور امّڈاری کی شہوتی شاموں کو بھلا کر سہسرام کی راہوں میں چراغ جلاتے رہے اور آمڈاری کے محال وارث علی کی کھنڈر نما حویلیوں، پرتی زمینوں اور قبرستانوں میں اندھیرے کی عفریت اپنے پنجے گاڑتی رہی اور ویران رہگزاروں پر قدِ آدم گھانس اُگ آئی۔ جن کے درمیان سانپ اور بچھو سرسراتے رہے اور امیر کبیر قطب الدین مدنی کا سفر گڑدا، مانک پور، بدایوں، داناپور، آمڈاری، دینارہ سے گزرتا ہوا سہسرام اور اورنگ آباد تک پہنچا اور اب باشندگانِ ارض کے

زمینی بکھراؤ کے طفیل جانے کہاں کہاں تک پہنچے گا؟

تو رفیقو! اوروں کا تو پتہ نہیں، البتہ حسین الحق کا مقدر بکھراؤ ہے۔ زمینی اور ذہنی دونوں!

کہ آج عید کی شب ہے ـــــ خوشی سے بھرپور شب ـــــ اور اپنے پیارے شہر سہسرام کی گلیوں میں دن بھر گھوم کر اب نشاط کے پہلو میں لیٹا ہوں تو آرام کرنا چاہئے نا بھئی؟ مگر وہی تقدیر ... جس کا تذکرہ میں کر چکا ... زمینی بکھراؤ اگر نصیب بھی ہوتا ہے تو دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بیتی رہگذاروں پر تڑپتا نظر آتا ہے۔

اب آج سارا دن یہ سب کچھ دیکھنے اور سہن کرنے میں گذر گیا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟؟ مطبخ اور بورڈنگ میں کھانے اور لڑکوں کی جگہ اگر بکھیڑے نظر آتے ہیں تو میرا کیا قصور؟؟ نانی اماں کے گھر کا ایک حصّہ جدا ہو گیا تو یہ مسئلہ تو دراصل اماں باجی اماں اور ماموں جان کا ہے ـــــ مگر نہیں ـــــ کسی کا کوئی قصور نہیں ـــــ وقت کا رہوار تیزی سے بھاگتا چلا جا رہا ہے اور یہی ہماری تقدیر ہے۔

میں آہستہ اور جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے لڑکر دیکھتا ہوں، کہیں نشاط نے دیکھ تو نہیں لیا ـــــ ورنہ وہ جذباتی لڑکی میرے ایک ایک آنسو پر اپنے آٹھ آٹھ آنسو نچھاور کرے گی اور اُس وقت تک روتی رہے گی جب تک میں اُسے وجہ نہ بتا دوں ...

مگر میں اُسے کیا وجہ بتاؤں؟

میرا نانی ہال اور دادی ہال سب اُجڑ گیا۔ اب کہیں کوئی گول

نہیں دغتی، براق نہیں بجھتی ـــــ حضرت فرید ثانی کا عرس ناک کا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے ـــــ سواو رنگ آباد تو دور کی بات ہے۔ ہم محلے میں رہ کر گھروں میں فاتحہ پڑھ کر بیٹھ رہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ تعزیے روانہ ہونے سے پہلے اب بقرعید و میاں کے یہاں سے شربت آتا ہے ـــــ کتنے محرم آئے اور گذر گئے، کتنی برساتیں آئیں اور چلی گئیں، ہم نہ کربلا گئے نہ سیتا کنڈ ـــــ تعزیے کے ساتھ جب ہمارے چھوٹے بھائیوں کے چھوٹے بھائی اچھلتے کودتے چلتے ہیں تو ہم انھیں نصیحت کرتے ہیں:

فلاں فلاں رستے پر اکیلے نہ جانا ـــــ نہیں نہیں، ابھی رات باقی ہے ـــــ ابھی پٹھان ٹولی سے آگے نہ بڑھو ـــــ"

پھر خیال آتا ہے، پتہ نہیں شمیم کیسا ہے۔ برسوں سے اس کا خط بھی نہ آیا ـــــ بھاکو سیوان جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ اگر وہاں کا مقدمہ ختم ہوگیا تو محرم میں آجاؤں گا ـــــ مگر نہیں آئے ـــــ مظاہر کہاں ہے ـــــ ہاشم کا پیر ٹوٹ گیا، راور کیلا سے نہ آسکا ـــــ دونوں صدر کا میل ہوتے ہوتے اب سورج نکل آتا ہے اور چھتوں، بالا ریزوں اور چوکھٹوں پر ٹکے چاند اونگھتے اونگھتے سو جاتے ہیں ـــــ اور میرا چاند؟ ـــــ میری شیمی؟؟ ـــــ جانے کس شہر میں وہ چاند چمکتا ہوگا ـــــ؟؟؟

برسات اب بھی آتی ہے مگر چھپر نہیں ٹپکتی ـــــ ابّا سے بحثیں نہیں ہوتیں، کوئی لڑکی بادلوں، رہگذاروں اور آنگنوں میں غرارہ پہنے، پھیر پھیر کرتے نہیں چلتی ـــــ درگا پوجا آکر گذر جاتی ہے تو دل کی بے چینی قدرے کم ہوتی ہے ـــــ دلے بجز گذشت .... مینا کشی؟

سالا مہیش بھی نہ جانے کہاں ہے؟ ورنہ اُسی سے پوچھتا!

ہم وقت کے جس حصار میں گردش کر رہے ہیں اُس میں اشیاء کی کیفیتیں بدلتی ہیں، ماہیتیں نہیں بدلتیں ـــــ شاید ـــــ

پہلے بھی ہم جاگتے تھے، اب بھی جاگتے ہیں، پہلے کھپریوش چھت کے نیچے "سہو مست و سُکر مست و حال مست و قال مست" کے نعرۂ مستِ الست میں گم دو باپ بیٹے نمک روٹی کھا کر رات بھر روسو کی کتاب "معاہدۂ عمرانی" پر بحثیں کرتے رہتے تھے ـــــ یہی دونوں باپ بیٹے اب بھی جاگتے ہیں ـــــ مگر باپ پہلی منزل پر ـــــ پختہ، ہوادار، صاف ستھرے کمرے میں، نئی خریدی مسہری اور اُس پر بچھی صاف ستھری چادر اور تکیے پر سر رکھے پریشان رہتا ہے رات بھر۔ چاپ لیٹا رہتا ہے اور ہر آہٹ پر چونک اُٹھتا ہے۔

کہیں گولی چلی؟

کوئی چھت پر کودا؟؟

کوئی ہنگامہ ہوا؟؟؟

پھر جب دل قدرے پرسکون ہوتا ہے تو پاندان کھولتا ہے۔ وظائف نے بلبوں کی راہ سے گذر کر اب سینے میں اپنا گھر بنا لیا ہے اور حی و قائم خدا ہم پر سایہ کیے ہوئے ہے۔

اور اسی حی و قائم خدا کے سائے میں ـــ نیچے ـــــ بیڈ لیمپ کی خوب صورت طلسمی روشنی میں ـــــ برقی پنکھے کی ہوا میں بیٹا رات بھر بیوی کے پہلو میں لیٹا ویران اور اُجاڑ رہگذاروں پر سانپ اور بچھو کی سرسراہٹیں سنتا ہے اور کھو جانے والوں کی تلاش میں خود بھی کھو جاتا ہے اور اس میں

کھو جانے کی خواہش رکھنے والی اُس کی بیوی تھک ہار کر سو جاتی ہے ـــــ اور وہ جاگتا رہتا ہے۔

ہاں وہ جاگتا رہتا ہے!

وہ جاگ رہا ہے ـــــ مسلسل جاگ رہا ہے کہ اب سونے میں کوئی لُطف نہیں ـــــ کہ چادر کھینچ کر اور کانوں میں کاغذ کی بتیاں گھما کر جگانے والا کھلنڈرا ڈاکٹر خود سو گیا ہے ـــــ اور ہزاری باغ سے سہرام تک کا راستہ اتنا طویل ہے کہ نہ کھلنڈرا ڈاکٹر اُس تک پہنچ سکتا ہے اور نہ وہ کھلنڈرے ڈاکٹر تک جا سکتا ہے ـــــ کوئی کسی تک نہیں پہنچ سکتا!

کوئی اپنے آپ تک بھی نہیں پہنچ سکتا!!

سب ہر لمحہ دُور سے بھی دُور تر ہونے کے بے اختیارانہ عمل میں مصروف ہیں اور وقت کار ہوا رتیزی کے ساتھ بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ مگر وقت کی ماہیت نہیں بدلتی ـــــ کتنی عیدیں آئیں اور گذر گئیں کتنے سورج نکلے اور ڈوب گئے ـــــ کتنے چاند اُبھرے اور غروب ہو گئے ـــــ مگر رات نہیں گذرتی ـــــ

چاروں طرف رات ہی رات ہے ـــــ نشاط اِس رات میں سو کر بے خبر ہیں ـــــ اور میں جاگ کر ـــــ

اپنی خبر لانے کے لیے چوطرفہ بے تحاشا اور بے محابا دوڑ رہا ہوں۔ مگر کہیں سے کوئی خبر نہیں ملتی۔

تو بے خبری کی دُھند میں رات کا سفر ـــــ لامتناہی سفر جاری ہے ـــــ اور درویشوں کے سجادہ سے روکش ـــــ یہ ایک

اکیلا راہی ـــــ بے خبری کے گھنے جنگل میں بھٹک رہا ہے ـــــ

" کوئی ہے ـــــ جو اسے اِس کے سجّادہ تک پہنچا دے ؟ "

" کوئی ہے ـــــ جو اِسے اِس کے سجّادہ تک پہنچا دے ؟ "

" بارِ الٰہا ! کوئی ہے ؟؟؟

میں اپنی آواز خود سُن رہا ہوں ـــــ آواز بار بار اُبھر رہی ہے۔ ڈوب رہی ہے ـــــ اور کہیں سے کوئی جواب نہیں آتا ـــــ اور رات نہیں گزرتی ـــــ اور نیند نہیں آتی ـــــ"

پس میں جاگ رہا ہوں ـــــ

ہاں ! میں جاگ رہا ہوں ـــــ

ہاں صاحبو ! میں اِنتظار میں جاگ رہا ہوں ـــــ

ہنوز

مَیں آہستہ سے نظر اُٹھاتا ہوں ـــــ

شام سر پر کھڑی ہے اور اپنے جھنڈ سے بچھڑا ایک تنہا کبوتر جلدی جلدی پر پھڑ پھڑاتا اپنے آشیانے کی طرف بھاگ رہا ہے۔

مغربی کنارے پر سنہرے رنگوں کی بوچھار ہے۔ جیسے کسی نے سونا پگھلا دیا ہو اور میرے ارد گرد گہرا سکوت ہے اور نیچے میری بیٹی اب تک اپنے کھیل میں مشغول ہے۔ شاید ایسی ہی کسی شام قطب الدین مدنی بھی تھک کر کڑا اِلٰہ آباد کی طرف آرام کی خاطر روانہ ہو گئے ہوں گے۔

میں آہستہ سے "آئینہ اودھ" بند کر دیتا ہوں کہ اس سمٹے میرے وجود کے اَن گنت ٹکڑے مجھ سے اپنا حساب طلب کر رہے ہیں اور میں سود و زیاں کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں خود غیر متوازن ہوتا جا رہا ہوں۔

عمر کی تیس منزلیں طے کر چکنے پر بھی یہ مسئلہ میرے لیے ناقابلِ تفہیم ہے کہ مَیں گزرے ہوئے زمان میں زندہ ہوں یا گزرتے ہوئے زمان میں ـــــ وقت تیزی کے ساتھ بھاگتا چلا جا رہا ہے اور میں اُس کے رتھ کے پیچھے ہوا کے رہوار پہ، اُس کے تعاقب میں ہوں ـــــ لیکن میں ہی اُس کی مخالف سمت میں بھی بے تحاشا بھاگ رہا ہوں

میں کدھر بھاگ رہا ہوں ؟ ——

آگے —— نہیں پیچھے —— پیچھے —— نہیں آگے ——

سمت کے تعین کا مسئلہ ذرا کٹھن ہے لیکن یہ طے ہے کہ میں بھاگ رہا ہوں اور میرے وجود میں چھپا میرا مرشد چپ ہے !

میں اندھا دھند ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوں اور ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے ضیاء الدین برنی سے ٹکرا جاتا ہوں تو اچانک یاد آتا ہے کہ قاضیِ بدایوں تاج الدین کا پتہ بھی پوچھتا چلوں مگر وہ تو صرف اُن کے ہزاروں فضائل گنا کر خموش ہو جاتے ہیں، اور بہت پوچھنے پر صرف اتنا بتاتے ہیں کہ اُن کے بھتیجے رکن الدین کو ان کی جگہ کڑا کا قاضی بنایا گیا، ابلاکھ پوچھتے پھریئے کہ "حضور والا بدایوں کے بعد اس فرزندِ رسول ؐ نے کہاں کے لیے رختِ سفر باندھا۔ مگر وہاں تو اک خموشی سو بات کے جواب میں ——

تو اب "آئینۂ اودھ" کھولیے کہ "تاریخ فیروز شاہی" یا دونوں کو طاق پر رکھ دیجئے، سب برابر ہے کہ میں بالکونی پر تنہا بیٹھا ہوں، ہواؤں میں اپنے جھنڈ سے بچھڑا، ایک تنہا کبوتر، اپنے آشیاں کی تلاش میں تیزی سے اپنے پَر پھڑ پھڑاتا بھاگتا چلا جا رہا ہے، نیچے میری بیٹی، تنہا بیٹھی اپنے کھیل میں مصروف ہے، اور باہر سائیں چمٹا بجا رہا ہے ——

کیسا عجب ہے یہ سب کچھ، دُھند اور سرّ سے بھرپور، نفسیات والے کہتے ہیں "کسی کو فنا نہیں" —— باپ کے نطفے کی شکل میں بیٹا اور بیٹے کے نطفے کی شکل میں پوتا۔ از آں دم تا ایں دم، پیہم رواں ہے زندگی —— پتہ نہیں یہ میرا شعور ہے یا اجتماعی لاشعور، عینی صاحب کہتی ہیں "وہ لوگ بڑے مجرم ہیں جنھوں نے اپنے خواب کھو

دیجئے۔" اب انھیں کیا بتاؤں کہ یہاں تو پانچ پشت سے سنت نبویؐ کی پیروی ہو رہی ہے کہ "شوربے میں روٹی بھگو کر کھاؤ، عالی دماغ بنو اور مرجاؤ" ——— سینہ بہ سینہ ——— قطب الدین مدنی سے لعل محمد قطبی اور سید احمد شہید تک، ——— اور تاج الدین سے مخدوم غلام اشرف وارث علی اور قاضی علی حق تک ——— یاد تو سب کچھ ہے مگر ——— یہ دور سفینے کا ہے ——— سینے کا علم باہر لاؤں تو دیوبندی بریلوی کا جھگڑا کھڑا ہو جائے۔

تو اب تشریف لا رہے ہیں جناب محمد علی صاحب قاضی بازید چکیا وی ثم دیناروی ——— ہاں جناب ارشاد ہو ———

تھا وہ وقت شاہ بابر کا ——— شیخ تاج الدین جب یہاں آیا
چار لاکھ دام کی ملی جاگیر ——— آئے پورب میں سب صغیر و کبیر
دانا پور تھا مقام رہنے کا ——— شاہ بدیع الدین واں ہوا پیدا

سبحان اللہ ——— ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

[ابھی حال میں دینارہ اور بازید چک دونوں جگہ جانا ہوا۔ مگر موصوف کا کہیں پتہ نشان نہیں ملا۔]

ملاقات ہو جاتی تو بتاتا کہ حضرت! آپ کی ہدایت کے مطابق دانا پور کورٹ کا سارا ریکارڈ دیکھ ڈالا۔ مگر چار لاکھ کیا، چار ٹکے کی بھی عطا کسی تاج الدین کے نام تلاش نہیں کر پایا، اگر آپ پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر دیتے کہ یہ دانا پور بہار والا نہیں، بلکہ یوپی کا ایک دور افتادہ قصبہ ہے تو دانا پور میں کچہری کے تابیدوں پر اتنا پیسہ تو نہ خرچ کرنا پڑتا ———

مگر خیر! وہ آمڈاری سے حاصل کیے ہوئے نسب نامے کے حوالے سے کم از کم مخدوم میر غلام اشرف کی بزرگی تو بیان کرتے ہیں، جی خوش ہوتا ہے کہ اللہ اللہ ہمارے بزرگ بھی کتنے محترم اور معزز گذرے ہیں، اور ایک میں ہوں، ناکارہ، آسکتی، کاہل کہ چار گھنٹوں سے میز سجا کر تاریخ فرشتہ ہی، نسب نامہ محمد علی، تاریخ غازی پور، بلیا گزیٹر، قلمی مخطوط در احوال مخدوم میر غلام اشرف علی مصنفہ الحاج شاہ واعظ الحق مسرور آمڈاروی ثم سہسرامی ثم اورنگ آبادی، اور محال وارث علی کے سلسلے کا کھتیان لیے بیٹھا ہوں لیکن کچھ بھی پڑھ نہیں پا رہا ہوں۔

کبھی امیر کبیر قطب الدین مدنی اپنی طرف کھینچتے ہیں، کبھی محمد علی دیناروی کبھی مخدوم میر غلام اشرف علی اپنی طرف کھینچتے ہیں کبھی قاضی وارث علی —— اور میں ہیں کسی کہنہ اور خستہ حال مقبرے کی صدیوں پرانی برجی سے لٹکتی کسی انتہائی کمزور رسی کو پکڑ کر اس کے سہارے زمین پر آنا چاہتا ہوں مگر زمین ہنوز دور ہے اور میرے ہاتھ پیر رسی اور دیوار کی رگڑ سے لہولہان ہو رہے ہیں —— اور شام سر پر کھڑی ہے —— اور رات کی آمد آمد ہے —— اور مشرق و مغرب دونوں کا مقدر ایک ہے! ——

میں آہستہ سے آسمان پر، دور مشرق کی طرف نگاہ کرتا ہوں ——

اپنے جھنڈ سے بچھڑا، ایک تنہا کبوتر، آشیانے کی تلاش میں، اُسی طرف بھاگتا چلا جا رہا ہے، جدھر سے رات تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہے اور نیچے میری بیٹی اپنے کھیل میں مشغول ہے، آج دیوالی کی رات ہے، ابھی اس کی دوست رما آئے گی، وہ اس کے آنے کے پہلے اپنا گھروندا سجا لینا چاہتی ہے، اور میں

ان الفاظ کے سحر میں گم ہوں کہ " وہ لوگ بہت بڑے مجرم ہیں جنھوں نے اپنے خواب کھو دیئے "۔ —— میں اپنی بھی نظر میں گا ہے مجرم لگتا ہوں، گا ہے منصف —— کہ یہاں قلمی مخطوطہ در احوال مخدوم غلام اشرف کھلا ہوا ہے اور وہاں میری بیٹی دیوالی کے موقع پر اپنا گھروندا سجا رہی ہے —— اور باہر سائیں چمٹا بجا رہا ہے —— اور میرے ارد گرد دُھند کی دبیز چادر تنی ہوئی ہے۔

" تاریخ غازی پور " میں مخدوم میر غلام اشرف علی کو بچی تڑا اور بلیا کے بر گنے دیئے جانے کا تذکرہ ملتا ہے، لیکن پھر کیا ہوا۔ کچھ خبر نہیں، محمد علی دیناروی بھی ڈیڑھ سو برس سے اُن کی بزرگی کی مالا جپ رہے ہیں کہ ؎

اشرف الناس تھے وہی اشرف۔

مگر انھیں بھی کچھ خبر نہیں، جب بہت پریشان کیا تو خرابیٔ صحت اور مشغولیتوں کی بنا پر ملاقات نہ رہنے کے سبب لاعلمی کا بہانہ کر گئے اور تب مجبوراً مجھے شاہ وحید الحق آمڈاروی، شاہ عبدالعزیز آمڈاروی ثم سہرامی اور الحاج شاہ واعظ الحق سرور سہرامی ثم اورنگ آبادی سے رجوع کرنا پڑا، اور جب میں طفلکِ ناداں کی طرح مچل پڑا تو فوراً جبراً صرف میری خاطر اُن بزرگوں نے اذکار و نوافل کا سلسلہ مختصر کیا اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد کسی کونے کھدرے سے اپنے اپنے سفینے نکالے اور سو سو برس پرانی تحریر بمشکل تمام پڑھی اور تب یہ بتایا کہ حضرت میر غلام اشرف علی سے سکندر پور کے قاضی پورہ یا شیخ پورہ میں ملاقات شاید ممکن ہو میں نے پوچھا " حضور! یہ " شاید " کیا معنی رکھتا ہے؟ " تو فرمانے لگے کہ " بھئی دو سو برس سے اوپر کا عرصہ گذرا جب ہم لوگوں نے اُنھیں سکندر پور میں کھوج نکالا تھا، اب سکندر پور قاضی پورہ میں ہے یا شیخ پورہ میں اور شیخ پورہ

قاضی پورہ میں ہے یا قاضی پورہ شیخ پورہ میں' یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔

تو میں وقت کے حصار میں قید ہوں اور وقت مجھے چک پھیریوں پر چک پھیریاں دے رہا ہے اور ان چک پھیریوں سے میرا سر گھوم رہا ہے اور یہ فیصلہ میرے لیے ناممکن ہو رہا ہے کہ بھاگتے ہوئے وقت کے رتھ کے پیچھے ہَوا کے رہوار پر جو اس کا تعاقب کر رہا ہے وہ میں ہوں، یا جو اُس کی مخالف سمت میں بھاگ رہا ہے وہ میں ہوں۔

بہر حال! میں ہوں — اور میرے ارد گرد رات کھڑی ہے —— دُور دور تک جلتے دیوں کی قطار ہے اور نیچے میری بیٹی کے ہاتھوں سے بنے گھروندے میں دیپ روشن ہیں اور اُن چراغوں کی روشنی میں سکندر پور اور آمڈاری جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔

پتہ نہیں سکندر پور کا کیا حال ہے۔ مگر آمڈاری میں تو اب بھی عالمگیر احمد، نصیر احمد، جمیل احمد اور پردھان وغیرہ کے کھپریل کے مکانات میں شام ڈھلے مٹی کے چراغ اور لالٹینیں جلتی ہیں (اور محال وارث علی کی پرتی زمینوں اور قبرستان میں ایسا اندھیرا رہتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے) اور ان نیم روشن خام مکانات سے چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی یوں چھن چھن کر آتی ہے جیسے سہرام میں، شب برات کے موقع پر حضرت مخدوم محمد صالح صاحبؒ کے قبرستان کے چاروں طرف ہَوا کے رُخ پہ جلتے چراغوں کی کمزور لو ہواؤں سے لڑتی ہے، لگتا ہے کچھ ہار جاتے ہیں اور کچھ یہ گنگناتے ہوئے جیت جاتے ہیں کہ

ع اب اُن سے بُلاوا آتا ہے

ایسا لگتا ہے کہ جیسے مجھے بھی کوئی سکندر پور اور آمڈاری سے بُلا رہا ہے، کوئی کون؟ مخدوم میر غلام اشرف؟ وارث علی؟ غلام یحییٰ؟ عبدالحکیم؟

آخر کون؟ جانے کون؟ کوئی ہے جو سوتے جاگتے مجھے کہتا ہے ـــ "چلو ـــ بھاگتے ہوئے وقت کی مخالف سمت میں چلو ـــــــ۔

اور میں حال، مستقبل سب بھول جاتا ہوں ـــ

میں بس لوٹ جانا چاہتا ہوں ـــــ

کسی بھی ایسے مقام پر جہاں بچھڑے ہوؤں سے ملاقات ممکن ہو۔

لیکن ابھی رختِ سفر تیار بھی نہیں ہو پاتا ہے کہ کنور سنگھ کے ساتھی اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے سپاہی قاضی علی حق، حضرت مخدوم محمد صالح صاحب کے باغ میں آرام فرماتے ہوئے چپکے سے کہتے ہیں " میاں جو گزر چکا اُسے یاد مت کرو۔" سوچا حضرت ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ واپسی میں حضرت گھنّو دیوان کے چبوترے پر حضرت حافظ شاہ وجیہ الحق مسکین سہسرامی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ ڈپٹ کر فرماتے ہیں " جو آگے آنے والا ہے اُس کے بارے میں سوچنے والا تو کون ہے؟" ـــ اُن کی نظروں کی تندی اور جلال کی تاب نہ لا کر دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوتا ہوں تو مرشدی و مولائی حضرت مولانا انوار الحق شہودی فرماتے ہیں " بیٹے حال کا کوئی اعتبار ہے، یہ تو ہر لمحہ گذر رہا ہے، یہ حال ہے ہی کہاں؟ یہ سب کچھ تو صرف عارضی ہے ـــــ"

اور تب ایک مرتبہ پھر وقت مجھے چک پھیریوں پر چک پھیریاں دینے لگتا ہے، میرا سر گھوم رہا ہے اور میری بچی پکار رہی ہے " پاپا۔ آپ نیچے آئیے نا۔ دیکھئے ہم نے کتنا اچھا گھروندا بنایا ہے ـــ" اور سکندرپور اور آمڈاری سے کوئی پکار رہا ہے ـــ "آؤ ـــ آؤ ـــــ"

اور میرے چاروں طرف گہری سیاہ رات کا خیمہ اپنی مضبوط بنیادوں پر

قائم ہے ــــــ

جانے اپنے جھنڈ سے بچھڑا کبوتر اپنے آشیانے تک پہنچ سکا یا نہیں کہ رات گہری ہوتی جا رہی ہے — چراغ ہوا کے رُخ پر کب تک اپنے کو روشن رکھ سکے گا؟ اور کہیں بہت دُور سائیں اپنا چمٹا بجاتا، بے تابانہ گاتا گزرتا چلا جا رہا ہے

میں تیزی سے نیچے اُترتا ہوں اور اپنی بیٹی کے گھروندے کے سب چراغ بجھانے لگتا ہوں ــــ" میری بیوی لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیتی ہے" پاگل ہو گئے ہیں؟ کتنے شوق سے اُس نے یہ گھروندا سجایا ہے!"

اور تب میں اُتنی ہی تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر دوڑتا ہوا اوپر آتا ہوں اور جلدی جلدی اپنا چار سیل کا ٹارچ روشن کر کے سیاہ مشرق کی طرف فوکس مارتا ہوں کہ جانے اپنے جھنڈ سے بچھڑا کبوتر اپنے آشیانے تک پہنچا کہ نہیں لیکن گہری سیاہ رات میں کچھ نظر نہیں آتا — اور جب میں تھک کر ریلنگ پر سر ٹیک دیتا ہوں تو صدیوں کا فاصلہ طے کرتی ہوئی ایک آواز مجھ تک پہنچتی ہے "— آؤ ــــ آؤ ــــ"

اور نیچے میری بیٹی اپنے گھروندے کے بجھے چراغ دوبارہ جلا رہی ہے۔

اور کہیں دُور ــــ سائیں چمٹا بجاتا، بے تابانہ گاتا گزرتا چلا جا رہا ہے ــــ۔

چڑیا رین بسیرا بابا
نہ گھر تیرا نہ میرا بابا
چڑیا رین بسیرا بابا ــــ!!

○○

گھنے جنگلوں میں

میں نے آہستہ سے ذرا سی لحاف سرکائی۔

چاروں طرف سردیوں کی گھپ اندھیری رات بکھری پڑی تھی۔ "کھیتوں کھلیانوں اور میدانوں پر کُہاسا اُتر رہا ہوگا۔" میں نے سوچا ــــ میں نے سوچا، اور دیکھا، اور سُنا۔

میرے دائیں طرف ایک چارپائی پر چچا نصیر احمد اور بائیں طرف ایک چارپائی پر چچا جمیل احمد نیند کے گھنے جنگل میں گم تھے اور کھپریوش دالان کی چھپّر سے ٹھنڈی ہواؤں کے تیر چل رہے تھے اور دالان کے دروازے پر ٹاٹ کے پڑے پردے ہل رہے تھے اور پردوں سے ہَوا کی آنکھ مچولی کے سبب دھند میں کھوئے بیرونی آنگن میں لگے امرود، لیموں اور نیم کے درخت یوں ہلتے لگ رہے تھے جیسے، ۱۸۵۷ء کے سپاہی زخم کھا کھا کر جھوم رہے ہوں۔ "سوا سو برس کا فاصلہ کیسے طے ہوگا؟" میرے من میں ایک آشنکا نے سر اُٹھایا۔

آشنکا کے تیز زہریلے دانتوں والا ناگ پھنکاریں مارتا رہا۔ میں محسوس اور غیر محسوس کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا ــــ کھیتوں، کھلیانوں اور میدانوں پر کُہاسا گرتا رہا اور کہیں دُور سے چوکیداروں کی آوازیں آتی رہیں۔

ہو —— ہو —— ہو —— مجھے یاد آیا، جب دن میں محال وارث
علی کی پرانی زمینوں اور قبرستانوں میں چکر لگا رہا تھا، تب بھی ایک
آواز بار بار اُبھر رہی تھی —— ڈوب رہی تھی —— مگر شاید عصری کثافتوں
یا اژدھام میں وہ آواز اپنا رستہ بھول گئی —— یا میں اُس آواز
تک پہنچنے کا رستہ کھو بیٹھا؟ —— خبر نہیں —— خبر نہیں ——

تحریر فرمایا حضرت قاضی وحید الحق آڈاروی نے کہ بزرگ ہمارے مثل
مخدوم غلام اشرف اور مولانا غلام یحییٰ عالی مرتبت بزرگ تھے۔ مقدم الذکر
برسہا برس تک مسلسل روزہ رکھتے رہے اور بوقت افطار امرود کے اُس
درخت سے جسے حضور نے خود لگایا تھا اور جو سال بھر پھل دیا کرتا تھا،
ایک امرود تناول فرمایا کرتے اور تونس ندی سے جھک کر ایک چلّو پانی
نوش فرمایا جاتا —— اللہ بس باقی ہوس! ——

موخر الذکر بزرگ کی شخصیت ہنوز تشنۂ تحقیق ہے کہ یوپی اور بہار
دونوں جگہ کئی غلام یحییٰ پیدا ہوئے اور سب ہی کسی نہ کسی طرح عہدۂ قضا سے
وابستہ رہے۔ اور تحریر فرمایا مورخ تاریخ فیروز شاہی نے کہ بزرگ ہمارے
مثل قاضی تاج الدین (قاضیِ بدایوں) مقام فنا کی اُس منزل پر واقع تھے
جہاں رسولِ اکرمؐ اُن کی تشبیہ و تجسیم اختیار کر کے مشتاقانِ دید کی پیاس
بجھاتے رہے ع تیرے کرم پہ منحصر میرے خدا کی آبرو

میں نے لحاف ذرا اوپر سرکالی کہ دسمبر کی سرد ہوا کے برفیلے جھونکے
آنکھ اور ناک میں تیر کی طرح گھسے چلے جا رہے تھے، طاق میں جلتی مدھم لالٹین
کی بہت ہی کمزور روشنی میں دالان کا سارا منظر بڑا ہی پُر اسرار اور رومانی بنا

ہوا تھا اور چچا نصیر احمد اور چچا جمیل احمد نیند کے سمندر میں شاید خوابوں کی کشتی کھے رہے تھے۔

دیواروں پر سائے تیر رہے تھے۔

اور باہر چاروں طرف رات بکھری ہوئی تھی۔

" یہ سوا سو برس کے بعد تمہیں کیا سوجھی میاں؟ "

" ماضی مجھے بہت پریشان کرتا ہے حضرت۔ "

" واپسی ناممکن ہے۔ "

" مگر ٹھہراؤ بھی کب کسی کی تقدیر بنا ہے؟ "

" عمل تحرک صرف دائروی نہیں ہے۔ "

مجھے بہت زوروں پر ہنسی آئی۔ جی چاہا یاد دلاؤں کہ عہدِ زوال کی پیداوار تو دراصل آپ ہی لوگ ہیں۔ یہ سارا فلسفیانہ نقطۂ نظر تو گویا گریز کی ایک تکنک ہے۔ جب کشکولی میں آپ کے رشتہ داروں کے دروازوں پر جنگ لڑی جا رہی تھی، اُس وقت تک آپ کائنات کیا ذات کے تئیں بھی مخلص نہ ہو سکے اور ہر چہار اطراف لپٹیں لیتی تیز آگ سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں نکالی گئی، راستے تو صرف دو ہی تھے، یا تو مولّف سیر المتاخرین والا راستہ جو ناصر الحکام سے ہو کر گزرتا ہے یا مرشد آباد والا راستہ جس کے شروع، وسط یا آخر کہیں کوئی اور منزل نہیں۔

" خبر نہیں ـــــ خبر نہیں ـــــ "

دھند کی چادر چاروں اور تنی رہی ـــــ رات باہر چاروں طرف بکھری رہی ـــــ اور ـــــ

"حضرت کی تشریف آوری غالباً سکندرپور سے ہوئی؟" میں نے مودبانہ انداز میں سوال کیا۔

"ہاں میاں۔ اب کے قافلے والوں کو بہت دُور کا سفر طے کرنا نہیں پڑا۔" خالص یوپی والے لہجے میں جواب دیا اور گردن ترچھی کر کے سامان اُتارنے میں مشغول کسی مزدور کی طرف متوجہ ہوئے "ای تو کا کرت ہا؟ وارث تو ہیں کچھو سمجھ میں آوت ہے کا نا؟ ای بکسہ تو ہیں لے جائے کی نے چاہی؟"

نوجوان کے چہرے پر خفیف خِفّت کے آثار جھلکے اور فوراً بکس مزدور سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "اِس بکس میں شاید زیورات ہوں"۔ دل میں اک گمان گذرا اور فوراً بزرگ میری طرف مخاطب ہو کر بولے "نہیں میاں اِس میں موئے مبارک نقش پائے مبارک حضرت سرورِ کائناتؐ اور جائے نماز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام محفوظ ہے۔"

محفلِ سماع میں جب قوال اِس شعر پر پہنچا ؎

بہرِ قتلم چوں کشد تیغ نہم سر بہ سجود
او بہ نازے عجبے من بہ نیازے عجبے

تو صاحبِ سجّادہ حضرت مولانا غلام یحییٰ مثلِ ماہی بے آب تڑپا کیے، اور صاحبزادے، قاضی وارث علی شےؔ اور لاشےؔ کے گرداب میں اُبھرتے ڈوبتے رہے اور مراقبہ سے سر نہ اُٹھایا اور محفلِ سماع برپا رہی۔

تب ماضی کا مکان ماضی بعید میں گم ہو گیا اور قطب الدین مدنی نے صفیں آراستہ کیں:

"... قلب و جناح و میمنہ و میسرہ کو اس طرح پر ترتیب دیا کہ

بسرداری ولد اکبر امیر سید نظام الدین کے سید احسن ولد سید
محمد و شیخ منہاج الدین سردارانِ لشکر کو بہ ہراولی پیادگانِ
تیر انداز کے مقرر کیا و بسرکردگی امیر قیام الدین ولد اوسط کے
سید یوسف قتال و سید محمد خوشدغرف گوسائیں و سید بڑا کو میمنہ
پر مقرر کیا اور بافسری امیر تاج الدین ولد اصغر کے شیخ حاجی جمال
و شیخ ضیاء الدین مفسر و شیخ حسام الدین غوری سرخیلان کو میسرہ
پر مامور کیا اور شیخ شہاب الدین عمری و شیخ بڑا و شیخ بہاء الدین
سالاران کو پشتِ لشکر پر روانہ کیا ـــــ فقیر بمجرد دوڑنے فوج
راجہ کے دست بہ قبضۂ کمان اور تیر کے لے گیا اور مثل اولوں
کے تیر برسانا شروع کیے کہ اس میں راٹھور مع اپنی فوج کے رو
گرداں ہو، اس بھاگنے میں بہت فوج راجہ کی ماری گئی اور
شکستِ فاش راجہ راٹھور کو اور فتح عظیم نصیب لشکرِ اسلام کو
ہوئی .... "

پھر "آئینۂ اودھ" مصنفہ مولانا ابوالحسن مانک پوری کے اوراق ہوا میں
بکھر گئے ـــــ

اور میں اُن بکھرے ہوئے شکستہ اوراق کو سمیٹنے کے لیے ہر چہار اطراف
پاگلوں کی طرح دوڑتا رہا اور ایک تیز بھیانک آندھی مجھے خزاں میں درخت
سے گرے زرد، کمزور، بے جان پتوں کی طرح اپنے طاقت ور جھکڑوں کے
بھنور میں گھیرے آگے بڑھتی رہی ـــــ

یہ آندھی کدھر جائے گی ـــــ؟

میں کدھر جاؤں گا؟

میں کدھر جا سکتا ہوں؟

مجھے تو ابھی تمام رستوں کا پتہ بھی نہیں ہے۔

یہاں بھی تو لوگوں سے پوچھتا پوچھتا پہنچا ہوں، سہسرام سے بکسر، بکسر سے اجیار گھاٹ، وہاں سے ساگر پالی ـــــ وہاں ایک ہوٹل میں چائے پینے کے بہانے گھس گیا، چائے پیتا رہا، چہروں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔

"آمڈاری کے راہی کتنے سے بانے بھائی جی؟"

"روا کے گھر بہار با کا؟"

("جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو) ــــ جی ـــــ نج ــــ جی ـــــ

(ہپ) ـــــ ناہیں تو!ـــــ"

"ناہیں کیسے بندھو؟ آپ کی بھاش بتلا رہی ہے کہ آپ اِس چھیتر کے نہیں ہیں ـــــ"

"دھت تری لسانیات کی ایسی تیسی!"

"چلیے آپ کو آمڈاری پہنچا کر اُسی اُور سے معصوم پور پرستھان کر جاؤں گا۔"

"پتہ نہیں وہ آمڈاری سے روانہ ہو کر معصوم پور پہنچے کہ نہیں کہ میں تو..."

"کہ میں تو ـــــ"

دروازے تک پہنچا بھی نہ تھا کہ چوکیدار نے دور ہی سے آواز لگائی

"کے ہا؟"

"کیا الغڑا لگا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟ حسنی حسینی سیدوں کے یہاں بھی اموی اثرات سے چھٹکارا نہیں؟"

قاضی صاحب ہنس کر کہنے لگے۔ "چپ رہو — چپ رہو — ملّت کا مفاد مجروح ہوتا ہے۔"

"آپ لوگوں نے تقیہ" کے لیے جواز تلاش کیا ہے۔"

"تیرے خاندان میں شیعیت کبھی نہیں رہی نالائق؟" انھوں نے ہنستے ہوئے میرے کان اینٹھے اور مجھے لیے ہوئے صدر دروازے سے بیرون حویلی پھر دالان، پھر ایک بڑا دروازہ، پھر ایک بڑا کمرہ اور پھر ایک بڑی دالان سے گذرتے ہوئے اندرونِ حویلی میں پہنچے۔

"اِس سے ملی ہو؟ یہ ۱۹۴۹ء میں پیدا ہونے والی ہماری سات پشت آگے کی ایک آزاد خیال مگر بے چین روح ہے۔"

"بی بی صاحبہ مسکرایا کیں اور میں چھ سات پشت پہلے رہنے والوں کے کھنڈرات میں مارا پھرا ——"

"یہاں سے محالِ وارث علی شروع ہوتا ہے —— اور وہ ——" نصیر چچانے بتایا —— قاضی وارث علی کا مکان تھا ——" یہ" —— نصیر چچانے ایک ٹیلے کی طرف اِشارہ کیا۔ "یہاں سُنا ہے کہ قاضی صاحب کی بیرونی بیٹھک تھی —— یہ ——" ایک اور طرف اُنھوں نے انگلی اُٹھاکر بتایا —— "یہ قاضی صاحب کی کچہری تھی ——"

یہ زمینیں —— ؟؟

علاقے کے کُرمیوں کے قبضے میں ہیں۔

بغل ہی حاجی رحمت اللہ عراقی کے پختہ مکان کے پختہ برآمدے میں قصبے کے کسی قضیے کا تصفیہ ہو رہا تھا۔

زوالِ آدم خاکی ——— ؟؟

" واضح باد کہ آبا و اجداد ہمارے آمڈاری ضلع بلیا کے باشندے ہیں، شاہانِ اسلام سے اُن کے لیے معافی و جاگیرات و نذرات بہت کچھ ملے ہوئے تھے، بالخصوص حضرت مخدوم غلام اشرف اپنے وقت کے غوث تھے، سب لوگ مطیع و مسخّر رہے اور غایت یہ کہ بادشاہِ وقت بھی دل دادہ حضور کا تھا، اُس کے بعد حضرت سید شاہ قاضی عبدالحکیم تک لوگ قاضی و مفتیٔ صوبہ مقرر ہوا کیے ..... "

" ارے سُنو تو ——— " میں نے ملفوظ حضرت مسرور سہسرامی ثم اورنگ آبادی بند کر دیا۔

" اِسی میں ناکہیں یہ بھی لکھا ہے کہ ابھی بھی پانچ جگہوں کی حصہ داری میں دادا وغیرہ کا نام درج ہے ——— اُس کو بیچنے کی کوئی صورت نہیں ہے ؟ " (ہمارے ابنِ عم مرکزی حکومت کے محکمۂ ریونیو سے وابستہ ہیں)

وحشیانہ رقص ——— پُراسرار، بھیانک اور اندھیری رات چاروں طرف چھائی رہی ——— کھیتوں، کھلیانوں اور میدانوں پر کہاسا اُترتا رہا اور ہارا ہوا سپاہی آمڈاری کے کھلے میدانوں میں اپنے آپ سے بے خبر رقص کرتا رہا، اور گاتا رہا ؎

منم عثمان ہارونی کہ یارِ شیخ منصورم
ملامت می کند خلقے و من بردار می رقصم

اور بستی سے باہر گماشتہ جی بیل گاڑی لیے انتظار کرتے رہے۔ اور

جب آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر کا پہر ٹھہرا تو ایک بوڑھا، ایک بُڑھیا ـــــ اور ایک لڑکا بستی کی گلیوں سے چھپتا چھپاتا نکلا، ـــ اور بیل گاڑی پر سوار ہو گیا۔

"چلا ہا نتھو بھائی ـــــ تنک بیٹھن سب کے اب لک سمان دو ٹریا تو ـــ" گماشتہ جی نے بیل گاڑی پر آگے چڑھتے ہوئے نتھو گاڑی وان سے کہا ـــــ

بیل گاڑی روانہ ہو کر کچھ دور ہی چلی تھی کہ بوڑھے کو کچھ یاد آ گیا۔

"گماشتہ جی ذرا رُکیے۔"

"کا بات ہا سرکار؟"

"ذرا روکیے تو گاڑی۔"

گاڑی رک گئی۔

"میں پانچ منٹ میں آتا ہوں ـــــ" بوڑھے نے بستی کی طرف رُخ کیا تو گماشتہ جی دوڑ کر آگے آ گئے۔

"سرکار بات کا ہا؟؟"

"گماشتہ جی! ہمارے بزرگوں کی روایت رہی ہے کہ جب ایک جگہ سے دوسری جگہ نقلِ وطن کرتے ہیں تو متروک گھر کی کوئی اینٹ یا تھوڑی سی مٹی ساتھ لے جاتے ہیں اور نئی جگہ بننے والے گھر کی بنیاد میں اُسے رکھ دیتے ہیں۔ میں صبح سے یاد کیے ہوئے تھا۔ اِسی وقت بھول گیا ـــــ"

گماشتہ جی ابھی سامنے سے ہٹے بھی نہ تھے کہ ایک طرف سے گرد و غبار کا طوفان سا اُٹھا اور ہواؤں کے ریلے کے ساتھ گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں۔

"سرکار ـــــ" گماشتہ جی نے بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ بوڑھے سپاہی کو گود میں لے کر بیل گاڑی پر رکھ دیا اور خود لپک کر آگے بیٹھتے ہوئے چیخ کر بولے "دُشمن دروجے پر آگین ہا سرکار ـــــ ہانکا ہو نھقو ـــ بھاگا ہو نھقو ـ

تازہ دم جوان بیل ابلق کی رفتار سے ایک سمت بھاگے جا رہے تھے۔ اور دوسری سمت سے ابلق پر سوار، دُرّانہ دوڑتے ہوئے بستی میں داخل ہو رہے تھے ـــــــ

ساری رات بستی کے محلات اور کھنڈرات میں چاپ اُبھرتی رہی ـــ اور ڈوبتی رہی ـــــ"

ساری رات ـــــ سردیوں کی گھپ اندھیری رات ـــــ چاروں اُور بکھری پڑی رہی ـــــ"

کھیتوں، کھلیانوں اور میدانوں پر کہُاسا اُترتا رہا۔

چچا نصیر احمد اور چچا جمیل احمد نیند کے سمندر میں جانے کا ہے کی کشتی کھینتے رہے ـــــ"

اور میں ساری رات ـــــ ہاں لوگو! ساری رات ـــــ"

مُنھ اندھیرے جب میں پہلی بس پکڑنے کے لیے بستی سے روانہ ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ـــ بستی سے نکل رہا تھا تو محال وارث علی کے قبرستانوں سے گزرتے ہوئے جی چاہا کہ رُک کر فاتحہ پڑھ لوں مگر یاد آیا کہ ابّا سے جھوٹ بول کر آیا ہوں کہ "گیا جا رہا ہوں ـــــ"

اگر یہ بس چھوٹی تو سہسرام چھ سات بجے شام سے پہلے نہیں پہنچ سکوں گا ـــــ"

اور ابّا کٹھہرے اختلاجِ قلب کے شکار ــــــ "

تو میں قبرستانوں سے گزرتا آگے بڑھتا رہا ــــ قبرستانوں میں قبروں کے پٹ کھلے رہے ـــ مُردے اپنی اپنی قبروں میں رقص کرتے رہے اور نعرۂ مستانہ بلند کرتے رہے ـــ اللہ ہُو ـــ اللہ ہو ـــ اللہ ہو

(چوکیدار کی آواز رات بھر آتی رہی تھی ـــ ہو ـ ہو ـ ہو ـ)

" آواز اور آواز کے درمیان کیا رشتہ ہے ؟ " میں نے بس پر چڑھتے ہوئے سوچا۔

ابنِ عم ایک ٹرک کے نیچے لیٹا، بڑے اطمینان کے ساتھ، ٹرک کی مرمت میں مصروف تھا ــــ میں نے بحکر بس ڈپو کے آس پاس ٹہلتے ٹہلتے دیکھا ــــ

گماشتہ جی ! ـ ہمارے بزرگوں کی روایت رہی ہے کہ "

" ... دُشمن نچّو بیچ انگاری ماں پہنچ گوا ہے ــــ بھاگا ہو بھائی جی ــــ گلین ماں چاروں اور چیچّا ہو گئیں ہا کبھیّا اٹاری اٹاری جیّا ــــ اَہو میر صاحب ــــ "

●●

کربلا

چاروں طرف ہُو کا عالم ہے ——

دُکانیں سرِ شام بند ہو چکی ہیں، رات کا پہلا پہر ہے مگر ایسا سناٹا ہے کہ اگر ایک کنکر بھی گر جائے تو شاید "چھن" کی آواز سے پورا علاقہ گونج اُٹھے، ماؤں نے بچّوں کو سویرے سویرے کھلا کر زبردستی سُلا دیا ہے گاہے گاہے کسی گھر سے بکری کے ممیانے یا گائے کے ڈکارنے کی آواز آتی ہے —— اور بس! ——

سڑکوں نے شاید ایسا سنّاٹا مدّتوں سے نہیں دیکھا ہوگا، صرف کبھی کبھی وین آکر رُکتی ہے تو اُس کے آنے، رُکنے یا دوبارہ اسٹارٹ ہونے سے فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے —— یا پھر بوٹوں کی ٹاپ گونجتی ہے —— ٹاپ - ٹاپ - ٹاپ —— اور سروں پر "خود" پہنے اور پشت پر لکڑیوں کی ڈھال رکھے نوجوان چارسیل کی ٹارچ جلاتے ہیں، اور تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے ٹارچ کا فوکس رات کی ہیبت ناکیوں میں اور اضافہ کر دیتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ٹارچ نہیں جلا بلکہ گھنے سیاہ جنگلوں میں آگیا بیتال اپنی لال لال خون آشام آنکھوں سے اپنا شکار ڈھونڈھ رہا ہو

اور اپنے اپنے گھروں میں محصور لوگ یوں سہم جاتے ہیں جیسے چمبل گھاٹی میں کسی تنہا مسافر کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہو، یا بھیانک جنگل کی خوفناک اندھیری رات میں کوئی بھولا بھٹکا راہی کسی چھل پیری کے نرغے میں آگیا ہو۔۔۔"

ہر گھر کا دروازہ بند ہے لیکن نیند شاید سب کی آنکھوں سے چھن چکی ہے، سڑک کے کنارے جو مکانات ہیں، اُن کے مکین اور زیادہ بے چین ہیں۔ جب ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو یوں چونک اُٹھتے ہیں جیسے آسمان سے بجلی اب تاک کر اُنھی کو نشانہ بنانے والی ہے، البتہ سڑک سے ذرا دُور پر جو محلے بسے ہوئے ہیں، وہاں یہاں سے ذرا کچھ مختلف صورت حال ہے کہ وہ اپنے دریچوں اور بالا ریزوں سے کم از کم حالات کا اندازہ لگا پاتے ہیں، مگر جیسے ہی ٹارچ کی روشنی اُن محلّوں کی طرف مُڑتی ہے اور بوٹوں کی ٹاپ کا رُخ اُدھر ہوتا ہے وہ جلدی جلدی سب کھڑکیاں اور دروازے بند کرکے کواڑوں اور کھڑکیوں کی جھرّیوں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ اور جو سڑک سے بہت دُور پر بسنے والے محلے ہیں، وہاں محلّے کی چوک پر یا کسی درگاہ کے اردگرد کچھ شریف صورت نوجوان بیڑی اور سگریٹ پیتے ہیں، اور ہر دوسرے لمحے چوکنّا ہو ہو کر اندازہ لگاتے ہیں کہ قدموں کی چاپ کدھر سے آئی اور جیسے ہی ٹارچ کی روشنیاں گلیوں کی طرف مُڑتی ہیں اور بوٹوں کی ٹاپ ہوا کے دوش پر تیرتی اُن کے کانوں کے قریب آکر ٹھہرتی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر متعینہ اڈّوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں اور دروازے بند ہو جاتے ہیں، کھڑکیاں لگادی جاتی ہیں، سہمے ہوئے زرد چہرے کسی بھی آنے والے حادثے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اور وہ جو ابھی ابھی نوجوان ہوئے ہیں، گاہے خوف زدہ ہوتے ہیں، گاہے غصّے سے اپنے

دانت کاٹتے ہیں اور بزرگ انھیں سمجھاتے ہیں، ڈانٹتے ہیں اور کسی کسی طرح اُنھیں ٹھنڈا کرتے ہیں۔

کئی دنوں سے مسلسل یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور اس کے تدارک کی کوئی صورت نہیں ہے، دن افواہوں میں گزرتا ہے، یا گھر سے باہر نکلنے کے جو اوقات مقرر کیے گئے ہیں اُن میں جلدی جلدی سودا سلف لانے میں ـــــ اور رات ـــ بھیانک رات دہشتوں اور خوفناکیوں کی سفیر بن کر آتی ہے، چاروں طرف مہیب سناٹے رینگتے ہیں، اور وین، بوٹوں کی ٹاپ، ٹارچ کی روشنی اور نا سمجھ بچوں کے نیند میں ڈر کر رونے کے علاوہ کبھی کوئی گدھا رینکنے لگتا ہے، یا بیک وقت ڈھیر سارے کتے بھونکنے لگتے ہیں ـــــ گدھے کے رینکنے پر شاید دو چار زندہ دل مسکرا دیتے ہوں، مگر کتوں کے بھونکنے پر ایک ایک فرد چوکنا ہو جاتا ہے اور بھونکتے ہوئے کتے جدھر جدھر بھاگتے ہیں اُدھر اُدھر بے چینی اور خوف بھی دوگنا ہو کر قلابچیں بھرتا ہوا پہنچ جاتا ہے، اور جب صرف بھونکتے ہوئے کتے بھاگتے ہوئے گذر جاتے ہیں تو یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی جاتی ہے، اور ماتھے کا پسینہ پونچھا جاتا ہے کہ " جوانوں نے بھگایا ہوگا "

میں مسلسل کئی دنوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور برداشت کر رہا ہوں گذرے ہوئے اِن چند ایام میں، میں کس کس طرح سے ٹوٹتا ہوں، تڑپا ہوں اور کھنڈر بنا ہوں اِس کا حساب کس کو دوں؟ یہ خسارہ کون پورا کرے گا؟ میں اِس سارے گندہ، بے ہودہ، ذلیل اور بدبو سے بھبھکتے ہوئے تسلسل میں کہاں تک شامل ہوں؟ اور کہاں سے الگ ہوتا ہوں؟ جو کچھ ہوا، جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا میرا حصہ اُس میں کتنا ہے؟ میں ایک کمزور دل کا

آدمی ـــــ جو رقت طاری ہونے پر دو چار غزلیں کہہ کر دل کا غبار نکال لیتا ہے ـــــ میں اس کی توسیع یا تخفیف میں کتنے کا حصہ دار ہوں؟

میں مسلسل کئی دنوں سے یہ سب کچھ سوچ رہا ہوں اور چپ ہوں لیکن اندر ہی اندر درد کی جو تیز اور زہریلی اَنی مجھے کاٹتی اور ذبح کرتی گزرتی چلی جارہی ہے وہ میرے لیے سرمد کی کٹی گردن کے عروج سے زیادہ تکلیف دہ ہے، کیوں کہ یہاں تو مرشد یا مسترشد کسی کو بھی کوئی روکنے یا ٹوکنے والا نہیں ہے بس ایک گندہ، ذلیل، بجبجاتے ہوئے مواد جیسا لس دار، بدبودار اور گھناؤنا تسلسل ـــــ اور یہ تسلسل دوسروں سے زیادہ میرے لیے بے نیام، چم چم کرتی، سر پر لٹکتی تلوار کہ دوسروں پر صرف ظاہر کا گھناؤنا پن عیاں ہے۔ مگر میں تو وہ مرغ ہوں جس کی آدھی گردن کاٹ کر چھوڑ دی گئی ہے، اور وہ آدھی گردن لیے سارے میں دوڑ رہا ہے۔

ملفوظاتِ خواجگانِ چشت میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ نے خواجۂ خواجگان غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی انگلی پکڑ کر فرمایا: ـــــ "اے فرزند دیکھ" ... اور حضرت نے دیکھا کہ یک لخت اٹھارہ ہزار عالموں پر سے پردے اُٹھ گئے اور یہ ساری کائنات حضور کے سامنے شیشے کی طرح جگ مگ جگ مگ کرنے لگی، اور جب حضور حضرت غریب نواز نے تمام عالموں کا معائنہ فرمالیا تو حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ نے اپنے فرزند معنوی کو اُس وسعتِ معنوی سے قلتِ ظاہری کی طرف کھینچ لیا ـــــ لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے وجود میں چھپا میرا رشد مجھے نئے جہانوں کے دروازوں تک چھوڑ کر خود واپس آجاتا ہے اور میری راہ

گم ہو جاتی ہے۔

مسلسل کئی دنوں سے یہ ہو رہا ہے، سورج ڈوبنے سے سورج نکلنے تک گھروں کے دروازے بند ہونے سے گھروں کے دروازے کھلنے تک ــــ سرگوشیوں میں باتیں ہوتی ہیں، دیواروں سے کان لگا کر باہر پیدا ہونے والی تیز اور مدھم چاپ کی نسبتوں کا تعین کیا جاتا ہے اور کواڑوں کے شگافوں سے جھانک جھانک کر یہ اطمینان کیا جاتا ہے کہ بوٹوں کی چاپ کے پیچھے دبے قدموں چلنے والے تو نہیں ہیں ــــــــ

اور جب یہ سب کچھ گذر جاتا ہے اور اطمینان ہو جاتا ہے تو پھر نہلے پر دہلے کی چوٹ پڑنے لگتی ہے، بادشاہ پیدل سے مات کھاتا ہے اور کوئن ڈراپ ہو کر بھی واپس آجاتی ہے کیوں کہ سفید یا سیاہ، کوئی اسٹرائیکر کے نشانے پر ٹھیک نہیں بیٹھتی۔
ــــ اور جب یہ سب کچھ گذر جاتا ہے تو میرے سینے پر سے ایک ریل گاڑی گذرتی ہے ــــ چھک چھک ــــ چھک چھک ــــ اور گذرتی چلی جاتی ہے ــــ اور ذبح ہوتا ہوا کوئی کبوتر مجھ سے آنکھیں لڑاتا ہوا چیختا ہے ــــ غرغوں ــــ غرغوں ــــ اور گولی کھایا ہوا کوئی پپیہا درد بھری آواز میں پوچھتا ہے "پی کہاں ــــ پی کہاں ــــــــ"

اور یہ سب کچھ گذر کر، گذر نہیں جاتا ہے ــــ ٹھہر جاتا ہے ــــ میرے سینے پر ــــ بالکل وہاں ــــ جہاں سے آواز اُبھرتی ہے ــــ دھک دھک دھک دھک ــــ تو ایسے میں آہستہ سے اُٹھ کر ادھر آجاتا ہوں۔ جدھر میرے ہُنرمند دوست اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔

یاروں نے اِسے لیبوریٹری کا نام دے رکھا ہے ــــــــ"

"پروفیسر صاحب! یہ دیکھیے۔" ایک ہزمند مجھے اپنے ہنر کا نمونہ پیش کرتا ہے — یہ سو آدمی کے لیے بہت کافی ہے، اِس کے لیے گرنا شرط نہیں ہے، صرف ہاتھ سے الگ ہو جانا چاہیے"

دوسرا ہزمند مجھے متوجہ کرتا ہے — اور یہ، یہ سر گز تک مار کر سکتا ہے۔ سر! اس کی گولی پہلے سیدھے جاتی ہے، پھر جسم کو چھوتے ہی چرخی کی طرح گھوم جاتی ہے، ایک مرتبہ ہم لوگوں نے اِس سے ایک نیل گائے ماری تھی —— سر! گولی تو پیٹ میں لگی تھی اور اوپر میں بس ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آرہا تھا مگر پیٹ کھولنے کے بعد پتہ چلا کہ اندر سے وہ حصہ اس طرح چھلنی ہوگیا تھا کہ دل، گردہ، کلیجی سب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تباہ ہو چکا تھا — اور یہ سر —— اور یہ پروفیسر صاحب —— اور یہ بھائی صاحب ——"

اور اُسی لمحہ میرے وجود میں چھپے میرے مرشد نے میری انگلی پکڑ لی اور حکم دیا۔ "فرزند! اِدھر بھی دیکھ!" —— اور فرزند نے اُدھر نگاہ کی تو اُدھر بھی ایسا ہی منظر درپیش تھا ——"

"بندھو! پیسوں کی چنتا مت کرنا" —— مستری کو سمجھایا جا رہا تھا۔

"بس مال ایسا ہو کہ چھیتر کا چھیتر ملیامیٹ کر دے ——"

"شریمان آپ نشچنت رہیں، کیول یہی پانچ سات سو کے لیے کافی ہے۔"

"خواجہ مجھے واپس لے چلو —— خواجہ مجھے واپس لے چلو ——"

میں چیخ رہا ہوں، اور مُرشد دروازے تک پہنچا کر خود واپس ہو چکا ہے اور اور میری راہ گم ہے — اور سینے پر ہزار بوٹوں کی ٹاپ گونج رہی ہے — ٹاپ ٹاپ — ٹاپ ——" اور میرے چاروں طرف سنّاٹا ہے اور تاریکی!

ابھی ابھی نیچے کنارے کی طرف بنے ہوئے کمرے میں میری بیٹی روتے روتے سوگئی ہے، کل سے اُس کا دودھ ختم ہوگیا ہے، اب صرف نیرکس بچ گیا ہے یا دال بھات ——— ان ہی چند دنوں میں اِسی دال بھات سے اس کی نمک چشی بھی ہوئی مگر چونکہ دودھ کی عادت چھوٹ نہیں سکی ہے، اس لیے بار بار رُو رو کر اُٹھتی ہے اور اُٹھ اُٹھ کر روتی ہے اور اس کے رونے ہی کے ڈر سے اُسے نچلے حصے میں منتقل کرنا پڑا تاکہ آواز باہر نہ جائے ورنہ بڑوں کے جاگتے رہنے سے شکوک و شبہات سر اُٹھا سکتے ہیں۔ اور دروازہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔

" ہالٹ ——— !" سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک تیز آواز کی گونج۔

" فائر ——— ٹھائیں ——— آہ آہ ———"

" اللہ ——— اللہ ———" میں سینہ پکڑے تڑپ رہا ہوں —

" اللہ کیسا تڑپا ہوگا ؟ کیا گذری ہوگی ؟ "

" خدا کرے ہم میں سے نہ ہو ———" ایک دوست دعا کرتا ہے۔

اور تب ایسے میں یاد آتا ہے کہ " فوائد الفواد " کا مطالعہ کرتے ہوئے جب تزکیۂ نفس کے بارے میں پڑھ رہا تھا تو ایک سوال نے سر اُٹھایا کہ " جب وجود کی وحدت ہے تو غیر کون ہے ؟ "

" غیر کون ہے ؟ غیر کہاں ہے ؟ ———"

جواب دھند میں گم ——— اور میں ذات اور غیر ذات کے دھندلکوں میں گھرا ——— ایک مجبور فرد ! ———

ایک مجبور فرد ——— جس کا مقدر تماشا ہے۔ ———

حادثہ پہلے دن ہوا ———

آج سے کئی دن پہلے ——

میرے نقطۂ نظر سے وجود کی وحدت تھی مگر قلتِ ظاہری نے وسعتِ معنوی کے احساس کو تھپک تھپک کر سلا دیا —— اور تب یوں ہوا کہ ڈرے اور سہمے ہوئے لوگ یک جا ہوئے کہ حفاظت کی کچھ سبیل نکالی جائے، مگر رستوں کی تلاش پتھر بن کر برسی اور بجلی بن کر چمکی — اور بیڑی بنانے والا لاغر غریب عبدالجبار صرف نظر اٹھا کر اتنا دیکھ سکا کہ تارج اُس کے سر پر کس نے جلائی اور پھر چیتھڑے گھونٹے ہوں بعد پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ لکھا گیا کہ "مقتول کے لیے رائفل سے نکلی ہوئی صرف ایک گولی کافی تھی ——"

تو مرنے والے کی نمازِ جنازہ میں سارا شہر اُمنڈ پڑا کہ مرحوم شہادت کے درجے پر فائز ہوا تھا اور شہید کی نمازِ جنازہ میں شرکت' ثوابِ دارین کا باعث ہے —— اور جب سارا شہر شہیدِ ملّت کے جنازے کے ساتھ قبرستان چلا گیا تو میں چپکے سے اُس کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا —— گھر کے اندر سے بیوہ کے سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں، اور ایک بچہ رو رو کر کہہ رہا تھا "اماں بھوک لگی ہے، بھات دو۔" اور دوسرا اُسے سمجھا رہا تھا "بابو چپ ہو جا' اماں کہاں سے کھانا دے گی، باوا شام میں اناج لائے گا' تب تو کھانا پکے گا۔" اور تیسرا پوچھ رہا تھا "اماں' اماں باوا کو لوگ چرپائی پر رلٹا کر کہاں لے گئے ہیں؟" —— اور چوتھا جو سب سے بڑا تھا وہ اُسے سمجھا رہا تھا —— ہم لوگ کے باوا شہید ہو گئے بڑا ہے۔" —— اور تب میں دروازے ہی سے لوٹ آیا۔

اور اُس دن سے ایک سمندری طوفان بار بار میرے وجود کی جڑیں اُکھاڑنے کے درپے ہے، اور میں طوفان میں گھرا، جڑ سے اُکھڑا، وہ درخت

ہوں جو اپنے جنگل سے اُڑ کر اور بھٹک کر کسی گہری کھائی میں گرنے کے عمل میں بتدریج مصروف ہے — اوپر آسمان —— دائیں بائیں دور دور یہ پہاڑ۔ اور نیچے تاحدِ نظر گرتا ہوا اپنا وجود اپنی ہی آنکھوں سے گر گیا ——"

کاش! یہ سب کچھ نہ دیکھا ہوتا —— کاش! یہ سب کچھ میری نظروں کے سامنے نہ ہوا ہوتا! — کتنے اطمینان سے چلا آ رہا تھا — پتہ نہیں مل کے آ رہا تھا، یا ملنے جا رہا تھا —— مگر تھا بڑی موج میں — جب کوئی بھی تمہارا ہر دیئے توڑ دے —— تب تم میرے پاس آنا پریئے — جب کوئی بھی تمہارا ہر دیئے توڑ دے — جب کوئی بھی ——

"ارے ارے —— ارے یہ کیا کر رہے ہو —— ارے رے بھیّا — بچاؤ —— بچا — بب — بغ —— اوغ — اوغ ——"

دھیرے دھیرے آنکھیں بند ہوتی گئیں —— مسافر کو رستے میں شام آ گئی۔ کٹی ہوئی گردن کنارے پڑی تھی —— بے سر کا جسم کچھ دیر تڑپا پھر ٹھنڈا ہو گیا —— گڈھا جب تک کھودا نہیں جا چکا، چاروں طرف سخت پہرہ پڑتا رہا، پھر جب اُسے اُٹھا کر گڈھے میں ڈالا جانے لگا تو مرشد نے سوال کیا "فرزند بتا غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟" میں کیا جواب دیتا؟ آہستہ سے رام نام ستیہ ہے —— رام نام ستیہ ہے، بدبداتا ہوا گڈھے کی طرف بڑھا، اور ایک ہمزمند سے صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ "بھائی اِسے قبلہ رُو ہی رہنے دو" کہ چوطرفہ خون آشام آنکھوں کے حصار نے ایک ہی جملہ دُہرایا "کیا مطلب ہے آپ کا؟" تو اب میں اُنھیں مطلب کیا بتاتا کہ اُنھیں تو غالب بھی فلم "غالب" کی غزل "یہ نہ تھی ہماری قسمت ..." کی وجہ سے یاد ہو گا —— بھلا وہ

"وفاداری بہ شرطِ استواری" والے غالب کو کہاں سے جانتے !

تو میں وہاں سے چپکے کھسک گیا، مگر آگے کی منزلوں میں مرشد بار بار سوال کرتا رہا " فرزندستا ! غیر کہاں ہے ؟ " اور میرے سارے وجود میں ایک قیامت خیز زلزلہ سر مارتا رہا، اور گھر پہنچتے پہنچتے خبر مل گئی کہ " سورج ڈوبنے سے سورج نکلنے تک اب کوئی باہر نہیں نکلے گا۔ " —— اور ہنر مند دوست مطمئن تھے کہ بدلہ لے لیا گیا۔

اور اب ہر رات یہ ہوتا ہے کہ سرِ شام گھروں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اور گلی میں اُبھرنے والی چاپ کا اندازہ دیوار سے کان لگا کر کیا جاتا ہے اور بوٹوں کی ٹاپ ہر گھر کے دروازے پر ٹھہرتی ہے اور میرے سینے کو روند کر گزر جاتی ہے —— اور گلیوں میں بوٹوں کی ٹاپ سے پہلے، بعد میں، اور ساتھ، کوئی بال بکھرائے، چہرے پر بھبھوت ملے، خون میں لہو لہان، گاہے روتا اور گاہے قہقہہ لگاتا گذرتا ہے —— اور نوجوان اندھیری گلیوں میں چار سیل کا مارچ مارتے ہیں، اور سپاہی آواز لگاتا ہے —— جاگتے رہو —— اور دروازے کی جھریوں سے خوف میں ڈوبے چہرے آنے والے حادثے کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ ——"

اور پھر جب یہ سب کچھ گذر جاتا ہے تو نہلے پر دہلے کی چوٹ پڑنے لگتی ہے۔

اور گریہ اور قہقہے کی یہ سماعت میرا مقدر ہے۔ کیوں کہ میں نے اپنے وجود میں ایک مرشد کی بَلا پال رکھی ہے جو نئے جہانوں کے دروازوں تک مجھے پہنچا کر خود واپس آجاتا ہے اور میری راہ گم ہو جاتی ہے —— جب کہ دوسروں کے لیے یہ اور اس جیسے بہت سارے دوسرے وقوعات یا تو وقتی حادثے ہیں

یا سیاسی سازش، یا قومی مسئلہ ——"

اور تب ایک ایسی ہی بلا خیز شب میں دروازے پر دستک ہوئی اور خوف سے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں، میری بیوی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی، "آپ کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی ؟" —— اماں نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو یوں اپنی آغوش میں چھپایا جیسے ہم دونوں مُرغی کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہوں، جن پر چیل کے جھپٹے (اچانک حملہ) کے خوف سے مرغی اپنے پَروں میں چھپا لیتی ہے ——"

جب کئی دستک کے بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تو باہر سے آواز آئی —— "کھولو بھائی —— مَیں ہوں ذکی ——۔

مَیں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا "اس خطرناک رات میں آپ کہاں ذکی بھائی ؟ —— "

تو ذکی بھائی نے مسکرا کر شعر پڑھا ؎

چراغوں کی لَو سے ستاروں کی ضَو تک
وہاں مَیں ملوں گا جہاں رات ہو گی

مَیں نے ہنس کر کہا۔ "کیوں ذکی بھائی ۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے، اور آپ کو شعر یاد آ رہا ہے ؟"

تو ذکی بھائی ذرا سا کبیدہ ہو گئے اور سنجیدگی سے کہا "میاں میں نے تو بادہ و ساغر کا سہارا لیا کہ جب جبر کار فرما ہو تو دو ٹوک لہجے میں کچھ کہنا ذرا مشکل ہوتا ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں ہر خطرناک رات میں تمہارے ساتھ رہا ہوں —— مگر تم بھول جاؤ تو یہ الگ سی بات ہے ——!"

"کہاں کہاں ذکی بھائی۔ ذرا بتائیے تو؟" میں نے پھر ہنس کر کہا تو ذکی بھائی خفا ہو کر کہنے لگے:

"اب گن کر تو نہیں رکھا ہے مگر اُس وقت بھی جب ٹونک سے چل کر رنتھمبور میں رات ہو گئی تھی، اور تم لوگ راستہ بھول گئے تھے —— اور اُس وقت بھی جب تمہارا گھر جل رہا تھا —— اور اُس وقت بھی جب تم وَین میں جلائے جا رہے تھے —— اور اُس وقت بھی جب ہٹیا میں تمہاری باجی شمیمہ جلتے ہوئے مکان کی کھڑکی سے بار بار جھانک کر دیکھ رہی تھیں، اور بے تابانہ تمہارا انتظار کر رہی تھیں، اور تم پہنچے نہیں پہنچ رہے تھے —— اور اُس وقت بھی جب جامع مسجد میں اللہ کی ذات تھی ——"

اور تب میں نے اُنھیں جان لیا اور آہستہ سے پوچھا "ذکی بھائی! اتنا دُور دیس کا سفر کرنے کے بعد آپ یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ آپ کو صرف ہنسنا چاہیے یا صرف قہقہہ لگانا چاہیے ——؟" تو ذکی بھائی یوں کھڑے ہو گئے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو اور بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا:

"اتنا تیز مت بھاگو افسانہ نگار، ورنہ میرا ولی عہد بننا ہو گا"

مَیں نے ہنس کر کہا "عمل میں تو ممکن ہے لیکن اظہار میں بندہ کو انکار ہے ——" تو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ذرا سا رُک کے اور مُڑ کر کہا ——

"قہقہہ قہقہہ اور گریہ گریہ میں فرق کرنا جانو برادر ——!"

اور ابّا جب تیزی سے اُنھیں روکنے کے لیے بڑھے تو میں نے اُنھیں روک دیا۔ "انھیں جانے دیجئے، ان کا کچھ نہیں ہو گا ——" ابّا حیرت سے

کہنے لگے ۔عجب آدمی ہو، ایسے حالات میں کہتے ہو کچھ نہیں ہوگا، جب کہ ایسے حالات میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے ـــــ کیا باہر گھومنے والے جوانوں سے ان کا کوئی تعلق ہے ـــــ ؟"

" نہیں ! یہ تو ـــــــ" میں کہتے کہتے رُک گیا اور ابّا بھی چپ ہو گئے۔ .لوٹوں کی ٹاپ پھر گونجنے لگی تھی ۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی کے رونے اور قہقہہ لگانے کی آواز سُنائی دی۔

اور مُرشد نے پھر سوال کیا " فرزند یہ غیر کون ہے ؟ غیر کہاں ہے ؟"

اور تب اُسی لمحہ ایک روایت یاد آئی جو بہت مشہور ہے کہ دیوان صاحب کے عرس میں بہت دنوں قبل دُور دُور سے وجودی فقراء تشریف لاتے تھے ، ایک سال شہر کے ایک رئیس کو جو تصوف کا قائل نہیں تھا ، مذاق سوجھا، اور ایک خوان ورقِ نقرہ سے سجا فقیروں کی خدمت میں بھیجا۔ اور جب فقراء نے غلاف اُٹھایا تو ورقِ نقرہ پر ایک پُرزہ رکھا نظر آیا جس پر لکھا تھا " جب وجود کی وحدت ہے تو مُرغ مسلّم اور غلیظ میں کیا فرق ؟" اور جب خوان کو ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ پورا خوان غلیظ سے لبالب تھا ۔ فقراء غصّے سے سُرخ ہو گئے ، سب بیک وقت تالاب میں کود دے ، خنزیر بن کر نکلے اور سارا خوان ہضم کر گئے۔

لیکن اب وہی تالاب جو کبھی فقراء کی کرامتوں کے صدور کا منبع اور مخرج تھا ، بھولے بھٹکے ، بے جسم کے سروں اور بے سر کے جسموں کا خزانہ ہے اور یہاں میں ہوں اور میرے اِرد گرد بجبجاتے زخموں کی تمثیل ـــــ ابھی ابھی میرے پڑوسی نے دیوار کے پاس آکر اپنے بیمار بچے کے لیے کوئی دوا مانگی ہے، اُن کے بچّے کو ایک سو تین ڈگری بخار ہے، ڈاکٹر بلانے کی ضرورت ہے مگر کون

ڈاکٹر بلائے گا اور کون ڈاکٹر آئے گا ـــــ مسیحائی کا ہر عمل لُنج ہو چکا ہے۔ اور قاتلوں کا گھیرا دن بہ دن تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ "خار پشت" کے کُتّے اور سیار ایک مرتبہ پھر آدمیوں کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں، اور سارے شاعر اور افسانہ نگار بند دروازوں کے شگافوں سے اِس سارے نِج کرتے تسلسل کے خاموش تماشائی ہیں ـــــ یہ وہ کربلا ہے جس میں نہ فرات پر پہرہ بیٹھا ہے اور نہ ہی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا کوئی حکم نامہ صادر ہوا ہے کہ جو منا بوت نہ کرے اُس کا سر اُڑا دیا جائے لیکن شہر بانو پھر بھی ڈری اور سہمی ہوئی ہے کہ کب کون جانے کس حُسینؑ کے گھر پر دستک ہو اور بند گاڑی میں پرندے پھڑپھڑاتے پھریں اور آزاد ہونے کی ہر راہ مسدود ہو چکی ہو۔

میں آہستہ سے نظر اُٹھا کر دیکھتا ہوں، میرا شہر، شہرِ شامِ غریباں کی تمثیل ہے۔ کھڑکی کے مکانات کے شگافوں سے اور پختہ مکانات کے شعاع دانوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنیاں ایسی محسوس ہو رہی ہیں جیسے قبرستانوں میں قبروں پر شمعیں بڑی مدھم لَو میں جل رہی ہوں ـــــ۔

اور تب اُسی وقت میری بیوی تیز تیز چلتی ہوئی میرے پاس آتی ہے۔

"کیا بات ہے نشاط؟"

"آپ ـــ آپ ٹھیک ہیں نا؟" نشاط مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

ٹھیک ہوں؟ کیا مطلب؟ ٹھیک تو ہوں ہی ـــــ کیا تم کو بے ٹھیک نظر آرہا ہوں؟"

مجھے ہنسی آئی ـــــ

تھوڑی سی جھلاہٹ بھی ہوئی ـــــ کہ شاید اب زینب کی دوبارہ نمود کا کوئی اِمکان نہیں ہے۔

"سُنیے تو ـــــ " نشاط مجھے کنارے بلاتی ہے۔ "میں نے ابھی ایک خواب دیکھا کہ میں آپ کے ساتھ بہت سے سامان کے ساتھ کہیں جانے کے لیے بس پر سوار ہوئی ہوں، جہاں اُترنا ہے، وہاں ہم دونوں اُتر نہیں پاتے، بس آگے بڑھ جاتی ہے، مجبوراً آگے بڑھ کر ہم دونوں بس سے اُترتے ہیں، اُترتے ہی میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے، میں بیچ سڑک پر گر جاتی ہوں، میرا سارا سامان بکھر جاتا ہے، آپ سے اُٹھانے کے لیے کہتی ہوں لیکن آپ چالیس قدم دور کھڑے ہنستے رہتے ہیں، میں کسی کسی طرح رینگ کر اپنا سامان یکجا کرتی ہوں، پھر اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں، تکلیف بڑھنے لگتی ہے، تکلیف کی شدت سے میری آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں، میں دھیرے دھیرے مُندھتی ہوئی آنکھیں بڑی مشکل سے کھولتی ہوں، اور ہر بار آپ چالیس قدم کے فاصلے پر کھڑے مسکراتے دکھائی دیتے ہیں، اور میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جاتی ہیں ـــــ بند ہوتی جاتی ہیں ـــــ اور پھر چاروں طرف اندھیرا ـــــ اتھاہ گہرا اندھیرا

میں ہنس کر اُس کے گال تھپتھپاتا ہوں، اور اُسے اطمینان دلاتا ہوں کہ ہر دُکھ سکھ میں اُس کے ساتھ رہوں گا، وہ چلی جاتی ہے، مگر میں اِس کائنات میں پھیلے ہوئے اسرار اور اُن اسرار کے اشاروں اور کنایوں کے ساتھ اظہار کے پہلو پر غور کر رہا ہوں ـــــ اور باہر سروں پر "خود" پہنے اور پشت پر ڈھال رکھے نوجوان چارسیل کا ٹارچ روشن کرتے ہیں، اور بوٹوں کی آواز گونجتی ہے ـــــ ٹاپ ـــ ٹاپ ـــ ٹاپ ـــــ

اور سپاہی کی آواز گونجتی ہے ——— "جاگتے رہو ———"

اور ابھی سپاہی کی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دھماکے کی ایک آواز سے پورا شہر لرز اُٹھا ——— اور پھر لگاتار کئی دھماکے ——— ہم دوڑ کر چھتوں پر پہنچے ——— روشنی ——— روشنی ——— روشنی ——— شعلے آسمان سے محوِ گفتگو ——— اور بوٹوں کی بھاگتی دوڑتی آواز ——— ٹاپ ——— ٹاپ ٹاپ ——— ٹاپ ——— "

"فائر ——— فائر ——— فائر ———" سناٹے میں گونجتی، کسی میجر کی کرخت آواز سے در و بام لرز اُٹھے۔

"کھائیں ——— کھائیں ——— آہ ——— آہ - آہ ———"

"جانے کون؟ جانے کدھر؟" میرے ارد گرد دبے چینی کا اژدہام اور میں خون میں لہولہان ——— درد سے تڑپ رہا ہوں ——— جانے کیوں جانے کیوں ——— ؟؟"

اور ایک تیز رفتار ٹرین میرے سینے پر سے دندناتی گزر رہی ہے، اور چاروں طرف زرد چہروں پر سائے لہرا رہے ہیں ——— اور میرے ہنرمند دوست جلدی جلدی اپنا کام نپٹا رہے ہیں ——— جانے کب اِدھر رُخ ہو جائے ——— اور سرحدوں پر نوجوان پہرے دے رہے ہیں پل پل کی خبریں لگاتار آ رہی ہیں ———

اور نیچے کے کمرے میں میرا بھائی ——— پاگل شاعر ——— میری روتی بچی کو بہلا رہا ہے ——— اور مسلسل گا رہا ہے ——— ۵

جو سائے دُور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں ، نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبو

جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں ——— یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو
وہ گائے جاتا ہے ——— مسلسل گا رہا ہے ——— اور باہر آگ لگی
ہوئی ہے۔

شاید فلسطین کا آخری کیمپ مسمار کیا جا رہا ہے، یا لینن گراڈ کا آخری گھر فتح ہو رہا ہے ——— یا شاید اکثر افراد ختم ہو چکے اور قافلے کا سردار سجدے میں ہے اور شمر سر پر چمچماتی تلوار سونت کر آخری وار کی تیاری کر رہا ہے ——— اور باہر گلیوں میں کوئی گا ہے روتا، گا ہے قہقہہ لگاتا گذر رہا ہے اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ پکار کر کہوں "ذکی بھائی اب بس کیجیے، اس کا کچھ حاصل نہیں ——— لیکن میرے اردگرد کی فضا میرے ارادوں کی قاتل ہے اور چاروں طرف بوٹوں کی ٹاپ گونج رہی ہے — ٹاپ ——— ٹاپ ٹاپ ٹاپ ——— ٹاپ ———

اور تب اُسی لمحہ بجلی بہت زور سے چمکی، بادل بہت زور سے گرجا، آندھی بہت زور سے اُٹھی، اور آسمان سے شعلوں کی بارش شروع ہو گئی، زمین میں چھپے آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا، دائیں بائیں سے بھیانک عفریت اپنے جبڑے کھولے آگے بڑھا ——— اور بیک وقت ڈھیر ساری بلاؤں کا نزول شروع ہو گیا اور مائی لائی سے کوئی عورت اپنے بچوں کو اپنے دامن میں چھپا کر دیوانہ وار بھاگی، اور ہندوستان و بنگلہ دیش کی سرحدوں سے کوئی بہاری دھکے دے دے کر پیچھے ہٹایا گیا ———

اور خبر لانے والے دوڑتے ہوئے آئے اور سرگوشیوں میں بتایا "وہ آگئے"۔
بوٹوں کی ٹاپ چند لمحوں کے لیے کسی دوسری طرف مڑ گئی تھی ———

اور سائے مُنھ پر نقاب لگائے اور ہاتھوں میں مشعل لیے — اور جیبوں میں — اور شانوں پر ——"

مدافعتی جنگ کا اختتام تو اکثر فرار ہی پر ہوتا ہے ——

باہر ہنر مند دوست اپنے اپنے جوہروں سے مایوس ہو کر روبرو مقابلے کے لیے دروازے کھول چکے ہیں، اور کہیں دُور کوئی سسکیاں بھرتا، پھوٹ پھوٹ کر رونا اور قہقہہ لگاتا بے تابانہ دوڑ رہا ہے —— اور گھر خالی کیے جا رہے ہیں —— "

میں جب نیچے والے کمرے میں پہنچتا ہوں تو میرا بھائی بے تابانہ کمرے کے طول و عرض میں چکر لگاتا اور گنگناتا نظر آتا ہے —— یہاں سے کچھ نہیں کھُلتا یہ پھول ہیں کہ لہو !! ——

" چلو پیارے، شاعری بھی ناکام ہو چکی ہے " میں نے آہستہ سے اُس سے کہا —— اور اُس کے چہرے کے بھیانک پن کو دیکھ کر نظریں نیچی کر لیں۔ آگے میں، اور پیچھے پیچھے میری ماں، والد اور میری بیوی، میری نگرانی میں بھاگ رہی ہے، اور لاٹھیوں سے لاٹھیاں اور تلواروں سے تلواریں ٹکرا رہی ہیں، اور دھماکوں سے سارا شہر لرز رہا ہے —— اور کھپریل کے مکانات میں لگی آگ کی تیز لپٹیں، میرے "پختہ" مکان کی طرف بڑھ رہی ہیں ۔—— اور تب ایسے میں —— "

میرے وجود میں چھپا ہوا —— میرا مُرشد میرے ساتھ بھاگتے بھاگتے مجھ سے سوال کرتا ہے " فرزند بتا! غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟ "

" چپ غیر کے بچے! " میں بھاگتے بھاگتے جھلا کر کہتا ہوں، اور وہ

خاموشی سے میرے ساتھ بھاگنے لگتا ہے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد پھر پوچھتا ہے۔

"فرزند بتا! غیر کون ہے؟ — غیر کہاں ہے؟"

"ارے حرامی! جیتے ڈسے گا، یا نہیں؟" بے ساختہ میرے مُنھ سے گالی نکلتی ہے — وہ چپ ہو جاتا ہے۔

لیکن کچھ دیر کے بعد پھر پوچھتا ہے "فرزند بتا! غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟"

میں رُک جاتا ہوں ——

وہ بھی رک جاتا ہے —

کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں ——

اور پھر — میں جھپٹ کر اُس کی گردن میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہوں، وہ کچھ دیر چھٹپٹاتا ہے، پھر ٹھنڈا ہو جاتا ہے — اور میں بوند بوند کر کے اُس کا خون پی رہا ہوں — میرے متعلقین بھاگ چکے ہیں، کچھ دوسرے لوگ میرے ارد گرد سے بھاگتے ہوئے گذر رہے ہیں، لیکن میں اُس کا خون پینے میں مصروف ہوں — اور میرا اپنا خوب صورت گھر دھڑا دھڑ جل رہا ہے، اور میں سوچ رہا ہوں، میری لائبریری بھی جل گئی ہو گی —— نہیں لائبریری نہیں — شاید ادبیات، سیاسیات، مذہبیات، سماجیات، اخلاقیات، روحانیات، معاشیات، تہذیب و تمدن — سب جل چکا۔

میں دیکھ رہا ہوں — میری لائبریری شعلوں میں گھری روشن ہے، اور میرا مرشد مُردہ پڑا ہے، اور اُس کا قاتل میں ہوں — اور کہیں دور روتا سسکیاں بھرتا اور قہقہے لگاتا گذر رہا ہے — اور بھاگنے والوں کی آخری کھیپ نے جب مجھے کھڑا دیکھا تو مجھے بھی گھسیٹتی ہوئی بھاگنے لگی ——

میں نے بھاگتے ہوئے دوسروں کی گفتگو پر کان لگایا ۔۔۔

"عبدل شاہ پھنس ہی گئے ۔۔۔" میرے دوست باتیں کر رہے تھے ۔۔۔

"کیا ہوا ؟" ۔۔۔ میں تڑپ اُٹھا ۔ "عبدل شاہ کو کیا ہوا ؟ وہ تو مجذوب آدمی ہیں ، سب اُن کی عزت کرتے ہیں ۔"

"مجذوبیت ہی میں تو مارے گئے ۔۔۔" ایک دوست بتاتا ہے ۔۔۔ "ہم لوگوں کے سامنے کی بات ہے ، اچانک وہ میدان میں کودے اور پورب ، پچھم ، اُتر ، دکھن چاروں سمتوں پر پیشاب کرنے لگے ، یہاں تک تو شاید قابلِ معافی ہوتا ، مصیبت تو اُس وقت آئی جب چاروں طرف پیشاب کر کے مڑے ۔۔۔ اور کرتا اُٹھائے اُٹھائے جوانوں کے سامنے آئے اور ایک جوان کے مُنھ پر پیشاب کر دیا ۔۔۔"

"تب ؟ ۔۔۔ تب ؟" ۔۔۔ میں بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ "تب کیا ہوا ؟" ۔۔۔

وہی جو ہونا تھا ۔۔۔ اور کیا ہوتا ؟ اور یہ تم رک کیوں گئے ؟ ہم سب کو بھی پھنسواؤ گے کیا ؟" ۔۔۔ ایک دوست پھر مجھے گھسیٹتا ہوا بھاگنے لگا۔

بھاگتے بھاگتے کسی نے کہا ۔۔۔ میں نے سنا ۔۔۔ لیکن قلندر واقعی قلندر تھا ۔۔۔ جوان کے رائفل تاننے سے اپنے دم توڑنے تک مسلسل قہقہہ لگاتا رہا ۔۔۔"

اور تب اُسی لمحہ میری نگاہ اپنے گھر کی طرف مڑی ۔

میری لائبریری دھڑ! دھڑ! جل رہی تھی ۔

اور اچانک اندر ہی اندر جانے مسرت کی کیسی تیز رو پائدار لہر دوڑ گئی کہ

میں خود پر ضبط نہ کر سکا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ہنستے ہنستے میں نے سنا۔ میرے دوست کہہ رہے تھے "اللہ اس کے حال پر رحم کرے، گھر لٹنے کا اثر پڑ ہی گیا۔"

دوسرے نے کہا "گھر تو گھر، اس کی لائبریری ہی میں لاکھوں روپیوں کی کتابیں جمع تھیں ——"

میں نے ہنستے ہنستے سوچا کہ انھیں بتاؤں —— "یارو! میں پاگل نہیں ہوں، قلندر کی فتح کا جشن منا رہا ہوں۔" —— لیکن میں یہ سب کچھ انھیں بتاتا نہیں ہوں ——

بس مسلسل بھاگ رہا ہوں، اور میرے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ اور ذکی بھائی جگنو کی طرح پل بھر کو جگمگاتے ہیں، پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ اور گھنے جنگلوں میں اگیا بیتال اپنے شکار کی تلاش میں ہے ——!

●●

رَبّا ، رَبّا

اِس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

لہٰذا گھر والوں نے رات کے بھیانک اندھیرے اور سنّاٹے میں بے جان جسد کو ناقہ پر رکھا اور ناقہ سرپٹ دوڑتا صحرا کی بھیانک دھند میں کھوگیا۔

اور اِس واقعے کو صدیاں گزر گئیں۔

اور اب ———"

ایک خارش زدہ جھبرا کتّا اپنی ڈراؤنی آنکھوں، ڈراؤنے چہرے اور لپ لپ کرتی باہر نکلی سُرخ سُرخ زبان سے لعاب گراتا، چہار دانگ عالم میں دوڑ رہا ہے اور ———"

اور میں ساحل پہ کھڑا ساحل کے کٹ کٹ کر سمندر میں ڈوبنے کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔

اور میرے ہمزاد ابوالفصاحت میر دُرِّ شہوار علی خاں بہادر شہر میں اپنے بابا کی بنوائی عالی شان اور خوب صورت کوٹھی کے پائیں باغ میں اپنے چمچوں کے ہجوم میں گھرے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہیں، اور اُن کے جدّی دیہی مکان میں سنّاٹا بھائیں بھائیں چیختا ہے، بیتے موسم کی

سرنگوں ہوائیں سسکیاں بھرتی ہیں اور کھنڈر نما محل سے ملحق اُجاڑ باغ کی جھاڑ جھنکاڑ جھاڑیوں میں سانپ اور بچھو آنکھ مچولیاں کھیلتے ہیں۔ اور .....

اور بُدھنی کا بیٹا کلکتیا بابو بن کر محلّے میں دندناتا پھرتا ہے۔

اَنا سہیل "———

چھوٹا ——— بے خبر ——— اپنی ذات میں گم ——— اَنا کی صلیب پہ چڑھا نا عاقبت شاعر!

تو نا عاقبت اندیش شاعر وقت کی دُھند میں گم ہو چکا ہے اور ابوالفصاحت میر دُرِ شہوار علی خاں بہادر کا ہمزاد مجلس سماع میں ہے

خبرم رسیدہ امشب کہ بہار خواہی آمد

پہ بے تابانہ رقص کرتا ہے، نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہے اور دمِ رقص سوچتا ہے کہ بہار میرے گھر کی طرف آتے آتے کدھر مُڑ گئی۔

اور جب قوال اس شعر پر پہنچتا ہے کہ ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف

بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

تو اپنے آپ میں گم، سایہ صفت ہمزاد دھپ سے اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہوا سوچتا ہے کہ کیا وہ میں ہوں؟ ——— میں کیا ہوں؟ ——— صحرا ہوں؟ ——— صحرا میں ہتھیلی پر اپنا سر رکھے انتھاہ انتظار میں ڈوبا اُداس ہرن ہوں؟ کہ وہ بے نام اور بے پیکر؟ جس کے انتظار میں صحرا آباد ہے!

بارِ الہا ——— بارِ الہا ———" جب آئینے کا زنگ چھٹتا

نہیں ہے اور وجود میں شامل بے خبری کا زہر کسی طرح امرت نہیں بن پاتا تو وہ دھاڑیں مار مار کر روتا ہے اور کہیں کوئی اور قلندر اندر ہی اندر ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہے ـــــ ہُو ـــــ ہُو ـــــ ہُو ـــــ"

اور تب ایسی ہی ایک خون آشام ساعت میں اُداس بوجھل اور جھکی پلکوں والے ایک بھولے بسرے معصوم سے چہرے کا عکس جھلملاتا ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے " یاد ہے؟ تم نے کہا تھا، میں وہ مسافر ہوں جو ایک موڑ پر پہنچ کر ٹھہر گیا ہے اور چاروں سمتوں میں مڑ مڑ کر اس امید میں دیکھتا ہے کہ شاید پیچھے چھوٹ جانے والے کبھی اُس تک آجائیں ـــــ"

تو بے چارہ سایہ صفت جلدی جلدی سر جھٹکتا ہے، اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی نم آنکھیں پونچھتا ہے اور پھر مشغول ہو جاتا ہے ـــــ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ـــــ" اور میں ...

میں ساحل پہ کھڑا کٹ کٹ کر سمندر میں گرتے اور ڈوبتے ساحل کا تماشا دیکھتا ہوں ـــــ اور صحرا کی بھیانک دُھند میں نہ جانے کیا تلاش کرتا ہوں؟

میں کیا تلاش کرتا ہوں؟ ـــــ میں کیا تلاش کر سکتا ہوں؟ ـــــ میری تلاش کیا معنی رکھتی ہے؟ ـــــ ازل سے ایک بے چین روح بھٹک رہی ہے۔ پَل بھر کو جسدِ خاکی میں نور جگمگایا تو لامکانیت کو مکان مِل گیا ـــــ نور من نور اللہ" پھر نور کہاں گیا؟ گریہ وزاری کرتے کرتے اچانک نگاہ اوپر اُٹھی تو انتہائی بلندیوں پہ ایک نام کا پھریرا لہریں لیتا نظر آیا اور صدقے میں خطا معاف ہو گئی۔

مگر پھر خطا ـــــ پھر خطا ـــــ"

میں کس کی خطا ہوں؟

میرے وجود میں ایک ہنگامہ بپا ہے اور میرے چاروں طرف سیاہ بھیانک رات کھڑی ہے ـــــ اور رات کی دُھند میں صحرا گم ہے ـــــ یا صحرا کی دُھند میں رات گم ہے ـــــ

اور وہ ناقہ ـــــ

اور ناقہ بھی صحرا کی دُھند میں گم ہو چکا ہے اور ابوالفصاحت اپنے حجروں میں گھرے فصاحت و بلاغت کا دریا بہا رہے ہیں۔

تو ابوالفصاحت میر دُرِّ شہوار علی خاں بہادر! اپنی لن ترانی بند کیجئے۔ اپنا کاروبار سمیٹئے اور چلتے پھرتے نظر آیئے ـــــ خالی کیجئے جگہ ـــــ خالی کیجئے ـــــ آپ سُن نہیں رہے ہیں؟ ـــــ کہہ رہا ہوں نا؟ ـــــ جگہ جلدی خالی کیجئے ـــــ وقت آگے بھاگتا جا رہا ہے ـــــ مسلسل بھاگتا جا رہا ہے ـــــ کل بہت پیچھے چھوٹ چکا ہے ـــــ خالی کرو ـــــ خالی کرو ـــــ

چیختے چیختے میرا گلا بیٹھا جا رہا ہے ـــــ ابوالفصاحت بے خبری کی دھند میں گم ہے اور سایہ صفت ہمزاد دیہی مکان کی اُجاڑ اور ویران رہگذاروں میں چکر لگا رہا ہے اور میں چیختے چیختے تھک کر بیٹھ گیا ہوں ـــــ اور میری ویران آنکھیں دیکھ رہی ہیں ـــــ"

میری ویران آنکھیں دیکھ رہی ہیں ـــــ دو بیگھے میں پھیلے اُس محل نما مکان کو جس میں ـــــ تین تین آنگن، تین بڑی بڑی دالانیں ـــــ انگنت بڑے بڑے کمرے ـــــ منقّش در و دیوار ـــــ دادا جان کی اونچی نشست گاہ ـــــ گاؤ تکیہ ـــــ پیچوان ـــــ مشاعرہ بھی ہوتا تھا ـــــ گرمیوں میں

چاند کی چودھویں تاریخ کو مشاعرہ ہوتا، سفید بھک بھک چادریں بچھتیں، مٹی کے کورے کورے گھڑوں میں برف دیا پانی، گھڑوں کی گردنوں میں بیلا، چنبیلی اور موتیا کا ہار ——— مشہور و معروف شعراء تشریف لاتے، شمع بڑھتی جاتی جاتی، شعراء غزلیں سُنائے جاتے اور چاند دھیرے دھیرے مدھم ہوتا جاتا ———

برسات آتی تو پائیں باغ میں جھولا لگتا اور پھوپھی جان لوگ جھولا جھولتیں۔ کیا سُریلی آواز تھی اُن لوگوں کی، بڑی پھوپھی شروع کرتیں ——— اِس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے۔ چھوٹی پھوپھی سُر میں سُر ملاتیں۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا ——— اور گھر کے کونوں کھدروں اور سیڑھیوں کی تنہائیوں میں کتنے پیمان ہوئے۔ وعدہ شکنی پر زنے کتنی بار آنسوؤں سے تر ہوئے ——— اب کون گنے ———

اب کون گنے کہ اب آنسوؤں کے قطرے نہیں ——— سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی موجوں کی بے پناہی ہے اور ساحل کٹ کٹ کر سمندر میں گرتا جا رہا ہے، اور ابوالفضا میر دُرِّ شہوار علی خاں کے شہر والے مکان کا آدھا حصّہ شیخ بفاتی میاں نے پچیس ہزار میں خرید لیا ہے۔ کیوں کہ بنگلور میں اُن کے صاحبزادے میر تہور علی کی فرم کا دیوالیہ نکل گیا تھا اور قرض چکانے کے لیے اُن کے پاس ایک پیسہ نہیں تھا۔

تو جب شہر والے مکان کا آدھا حصّہ بکا تو پھوپھی بلک بلک کر روئیں۔

اللہ اب یہ وقت آگیا ———"

ہاں بھائی دُرِّ شہوار علی! وقت آگیا ... تم اپنے حجروں میں گھر کر اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی فراموش کرنا کیوں نہ چاہو ——— مگر وقت آگیا ——— نوشتۂ دیوار پڑھو ——— خالی کرو ——— جگہ خالی کرو ——— وقت کے پاس اب وقت نہیں ہے ——— وقت کے ساتھ وقت کی بات گئی ——— بات گئی تو

رات گئی ـــــ رات گئی تو ذات گئی ـــــ ذات گئی تو ـــ تو ـــ تو"
ـــــ تو اچانک جانے کہاں سے ـــــ کن اندھیروں سے نکل کر ـــــ
سایہ صفت ہمزاد میرے سامنے آن کھڑا ہوا ـــــ غصے میں لال بھبھوکا ـــــ
سُرخ سُرخ آنکھیں لیے ـــــ دانت کچکچا کر چیخنے لگا ـــــ تو دھرد بوچا سالے
کا گلا ـــــ کاسٹرم کر رہا تھا ـــــ بہت سمجھایا کہ صلاحیت جس میں ہے وہی
افضل ہے ـــــ مگر لگا فقہ اور حدیث بگھارنے کہ سید افضل ہے ـــــ
پشم افضل ہے ـــــ دیا ایک ہاتھ تو سالے کی ساری سیدی دھری رہ گئی۔
مسجد ان کے باپ کی ہے ـــــ دس بیس امام مر چکے ـــــ اب گیارہواں بھی
سید ہی ہوگا ـــــ ابے سالے تو مولانا حافظ محمد اللہ رکھا نے حفظ کس
دن کے لیے کیا تھا۔ عالم کاہے کے لیے ہوئے تھے ـــــ کہنے لگا ـــ اس کی ماں اوپلے تھاپتی تھی۔
تمہاری ماں کا پتہ ہے سالے ؟ ـــــ بڑا سید زادہ بنتا تھا ـــــ الف ہوگیا
مسجد سے بھاگ کھڑا ہوا ـــــ اتنا بھی برداشت نہ کر سکا ـــ بھاگو سالو
ـــــ باپ کی جاگیر ہے ؟ ـــــ مذہب ہو کہ ادب، معاش ہو کہ سیاست
ہر جگہ گدھ کی طرح جھپٹا مارتے ہو ؟ ـــــ زمین کی ٹھیکریاں خلاؤں میں
رقص کریں گی ـــــ سہیل طلوع نہیں ہوگا ـــــ نہیں ہوگا ـــ نہیں ہوگا
سایہ صفت سایہ بن چکا ہے ـــــ نظر نہیں آرہا ہے ـــــ مگر مسلسل
گائے جا رہا ہے ـــــ مسلسل آواز آرہی ہے ـــــ سہیل طلوع نہیں ہوگا۔
نہیں ہوگا ـــــ اور ایک بڑی بھیانک اور زوردار آندھی میر صاحب کے گھر کی
طرف بڑھ رہی ہے، مگر میر صاحب کو خبر نہیں ہے ـــــ خبر کیسے ہو کہ وہ کمرے میں
بند ہیں اور کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے ہیں ـــــ مگر میں دیکھ رہا ہوں۔

آسمان کا بھیانک ڈراؤنا رنگ ــــــ فضا میں اُڑتے ہوئے تباہی کے ابخرات اور فضا پہ چھائے بھیانک دھوئیں کی دھند میں دَرّانا دوڑتا ہوا ایک غضب ناک ناقہ ــــــ اور میرے عزیز ابوالفصاحت میر درِّ شہوار علی خاں بہادر جو لحہ گزراں کے اسیر ہیں ــــــ لمحہ آیندہ سے بے خبر ــــــ تاریخ فیروز شاہی سیرالمتاخرین، فرشتہ اور آیئنہ اودھ سینے سے لگائے ــــــ اور کرامانکیور سے آمڈاری تک صفایا ہو چکا ہے ــــــ رہے نام اللہ کا ــــــ

رہا نام اللہ کا ــــــ بہت دنوں تک رہا ــــــ فجر کی نماز سے تین گھنٹہ پہلے دو ڈھائی بجے ہی دادا اُٹھ جاتے اور فجر تک گریہ وزاری میں مشغول رہتے ــــــ کریما بہ بخشائے برحالِ ما ــــــ گودڑی میں لعل ــــــ لعلِ شب چراغ شہر والے ان کے بڑے معتقد تھے، کئی کرامتیں زبان زدِ خاص و عام ہیں، یہ تو میری بھی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ وفات سے تین چار دنوں پہلے برسہا برس کی غائب بینائی اچانک گھنٹوں کے لیے واپس آگئی اور حضرت پورے گھر میں بغیر کسی سہارے کے چکر لگاتے رہے، یہ گھر اُن کی جوانی میں اپنے عروج پر تھا اور جب مائل بہ زوال ہوا تو دادا حضرت نے آنکھیں بند کر لیں اور فنائے کلّی سے کچھ ساعت پہلے ایک مرتبہ پھر ظاہر کی تباہی ظاہر نے ملاحظہ کی، شاید ترکِ ترک کی منزل تک پہنچنے کے لیے فنا برائے فنا بھی ناگزیر ہے۔

مکان کے ایک حصے میں پہنچے تو اونچی بڑی سی دیوار دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

"یہ کیا ہے؟"

"بڑے ابا کے لڑکوں نے بٹوارہ کر لیا، زبردستی ہم لوگوں کا بھی کچھ حصّہ غصب کر لیا" ــــــ ابا نے بتایا اچھی طرح یاد ہے کہ آہستہ سے مسکرائے اور

مدہم لہجے میں بولے " ہم جد نے ہمیشہ یہی رول ادا کیا ہے ۔ "

پھر بینائی واپس چلی گئی ۔

اور ابنِ جاحظ اور ابنِ خلدون جھپٹ جھپٹ کر میری آنکھوں پر حملہ کرنے لگے ——— لیکن میں کیا کر سکتا ہوں ؟ ———

خنزیروں کی فوج اپنی تھوتھنی اُٹھائے میری منتظر ہے کہ کب میں اُس کے راستے میں خطِ مستقیم بنتا ہوں ——— اور میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا کہ آہستہ سے کج ہو جاؤں اور خنزیروں کی فوج سیدھ میں دوڑتی گذر جائے ———

خنزیروں کی فوج سیدھ میں دوڑتی گذر جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ معاملہ ختم ہوا ——— لیکن دوسری سمت مڑتا ہوں تو اُدھر سے بھی خنزیروں کا ڈھیر دوڑتا نظر آتا ہے ——— پھر کج ہو جاتا ہوں ——— اور تیسری سمت مڑتا ہوں ——— اُدھر بھی خنزیروں کا ڈھیر "

چاروں طرف خنزیروں کی فوج جمع ہے ——— اور کج رہنا میرا مقدر ہے

اور چہار دانگ عالم میں خارش زدہ بھرا کتّا دوڑ رہا ہے ———

اور بے جان جسد برق رفتار ناقہ پر سوار ———

یہ صدیوں پہلے کی بات ہے ———

یہ صدیوں پہلے کی بات ہے مگر ابھی کل کی بات لگتی ہے ——— اماں بی بار بار یاد آتی ہیں اور بار بار اندر ہی اندر درد کی ایک تیز انی مجھے کاٹتی اور زخمی کرتی گذر جاتی ہے ——— ایسا بھی ہو سکتا ہے ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اماں بی کے ساتھ سلوک کا مسئلہ بھی مختلف فیہ بن جائے ؟ مگر بھائی لوگوں نے تو اُسے بھی مختلف فیہ بنا ہی دیا ہے ——— بھابھی زہرہ کہتی ہیں ——— لعنت بھیجو ! "

اور تب میرے اندر ہی اندر آہستہ سے ایک سوال سر اُٹھاتا ہے اور سانپ کی طرح رینگنے لگتا ہے ـــــ دشمن کون ہے؟ مخالف کون ہے؟ اختلاف کرنے والا کون ہے؟ منافق کون ہے؟

اور تب اُسی لمحہ سایہ صفت ہمزاد بے تابانہ رقص کرتا ہے اور چیختا ہے ؏

عَلیٰ کُلِّ شَیٍٔ قَدِیْر آمدی

اور میں ہاتھ اُٹھا کر گڑگڑا کر دعائیں مانگتا ہوں " اے اللہ! مجھے جاہلوں کے جیسا عقیدہ عطا فرما" ـــــ مگر میری آگہی میرے لیے زہر ہے اور میرا ساحل کٹ کٹ کر سمندر میں گرتا جا رہا ہے ـــــ اور ابو الفصاحت میر دُرِّ شہوار علی اپنے اُس ہرکارے پر چراغ پا ہو رہے ہیں جو یہ خبر لے کر آیا ہے کہ چھوٹّو پاسی نے اُن کے کھیتوں کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا ہے اور یہ بھی کہ اُن کا دیہات والا مکان، نتھّو میاں نے بے ایمانی سے اپنے نام کرا لیا ہے۔ تو میں بڑے دھیرج سے بھائی شہوار کو سمجھاتا ہوں کہ۔ " اب سب بیکار ہے!

جھلاّنے اور بگڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ـــــ جگہ خالی کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ـــــ عنایات و نوازشاتِ فرنگیاں کے صدقے جائیے کہ شہر میں آپ کے باپ دادا کی بڑی بڑی عالی شان کوٹھیاں بن گئی ہیں ـــــ تو اب جب آپ سب لوگ شہر آباد کیے ہوئے ہیں، دیہات والے مکان پر آپ کا کیا حق ہے؟ کھیت جو جوتے گا ملکیت بھی اُسی کی ہوگی، یہ تو طے ہو چکا ـــــ اس پر آپ خفا کیوں ہیں؟

ہاں ہاں صدیوں سے عادی بنا دیے گئے ہیں ـــــ یہی کہیے گا نا!

یہی چیز اگر ابتدا ہی میں سمجھ میں آ جاتی تو آج جو درد آپ کو تڑپاتا ہے،

اور شکست کا جو احساس آپ کے وجود کے ایک ایک حصے کو کھرچتا ہے، وہ آپ کا مسئلہ تو نہیں بنتا ——؟

جلاوطن کر دیئے جانے والے نے سمجھا مگر آپ نہ سمجھے —— کر دیا بے چارے کو جلاوطن —— خون منھ کو لگا ہوا تھا نا —— اور اس پر کرسی نشیں کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا —— بات مذہب کی قطعی نہیں تھی، سارا مسئلہ معاشی تھا مگر خدا مغفرت کرے جھوٹی جھوٹی باتیں گڑھ دینے والوں کی —— ایسا چکر چلا کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا —— ایسا الٹ پلٹ ہوا کہ سب سے بڑے ولدالزنا کو بھی رحمۃ اللہ علیہ کہنے والے پیدا ہو گئے۔

لہٰذا مصلحتِ ملّی کا زہریلا نیزہ جب اندھا ہو جاتا ہے تو بے جان جسد برق رفتار ناقہ پر رکھ کر کسی سمت روانہ کر دیا جاتا ہے —— ملوکیت کی ابتدا سے ملوکیت کی انتہا تک تمہاری نس نس میں جو زہر سرایت کیا گیا وہ اب دوسروں کے لیے نہیں تمہارے ہی لیے قاتل بن رہا ہے، اور تم اُسے دوسروں کی دین سمجھ رہے ہو —— چکی پیسنا تو تمہارے لیے باعثِ افتخار ہونا چاہیے تھا، مگر غزوہ سویق کو تم بھلا چکے ہو اور خارش زدہ جبرا گتّا اپنی تھوتھنی تمہارے منہ سے مل رہا ہے اور تم یہی سمجھ رہے ہو کہ"

خیر جانے دو —— بات تلخ ہو جائے گی اور رواداری کا تقاضا ہے کہ تلخی نہ پھیلائی جائے —— حالاں کہ مولانا حافظ محمد اللہ رکھا کے دادا کی زندگی میں تلخیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا، اور یہ تلخی تم نے —— ہاں برادر شہوار علی —— تم نے پھیلائی —— تم نہ سہی، تمہارے آباؤ اجداد سہی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اب یہ سب اعتذار ہے میاں، تاویل کار کٹ مت چلاؤ —— بے چارہ اللہ رکھا

اپنے تقدس اور تقشف کے خیال سے چپ رہتا ہے مگر تمہارے گھر اس کی بہنیں، پھوپھیاں اور خالائیں جو دن رات کھٹی تھیں اور رات گئے تک تمہارے دادا جان کے پیر دباتی رہتی تھیں تو کیا وہاں نماز باجماعت ادا ہوتی تھی ؟ ؟ —— گُھنڈی گر پڑی ——"

مگر نہیں یار —— چغد تم نہیں تھے —— چغد تو وہ غریب تھے —— اور اب جب ذرا عقل آئی ہے، تو تم بوکھلائے پھر رہے ہو ——"

مگر یار شہوار علی —— واقعی بے حیا ہو گیا ؟ سر پر آسمان نہیں پیر کے نیچے زمین نہیں —— مگر اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار نہیں ہو —— میری بات مان لو برادر ! خیالی کھمبا کتنے دنوں تک ساتھ دے سکے گا ؟

یونگ پریشان کرتا ہے نا ؟ —— لیکن مارکس، یونگ سے بڑی طاقت ہے پیارے —— ایسا نہیں ہوتا تو تمہارے صاحبزادے کو مکان کا آدھا بیچ کر قرض چکانے کی نہ سوجھتی "

" چپ رہو —— چپ رہو —— خدا کے لیے چپ ہو جاؤ —— پریشان مت کرو ——" ابوالفصاحت میر دُرِ شہوار علی بہادر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر چیخے اور میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گیا۔

تو اسی ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے ہوئے لمحے میں —— جانے کہاں سے بے پیکر سایہ صفت ہمزاد —— اُداس چہرہ لیے آن کھڑا ہوا —— اور اُداس لہجے میں بتانے لگا —— جس دن مکان بکا، بڑی پھوپھی بلک بلک کر روئیں اور دوسری پھوپھیوں نے آنکھوں کی نمی دامنوں میں جذب کر لی۔

ع غاشور کی شب تھی کہ قیامت کی گھڑی تھی

اور اُس رات ـــــ ایک بوڑھا اپنے جسم پر بھبھوت ملے، اپنے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتا اور اپنا خون پیتا، وحشت زدہ بھیانک سنّاٹے کی آماجگاہ، آنکھوں سمیت ـــــ آنگن کے بیچوں بیچ ـــــ مادر زاد برہنہ کھڑا آسمان تاکتا رہا اور چیختا رہا ـــــ وعدۂ دیدار کجا است ؟

ساری رات یہ ہنگامہ برپا رہا۔

اور جب سحر کی آمد آمد تھی تو زمین پھٹی اور وہ اُس میں سما گیا۔

" تو سمجھے بھائی شہوار علی ؟ " میں نے اُس کا شرمسار چہرہ اُس کے دونوں ہاتھوں کے ہالے سے باہر نکالا۔

انجیر کے درخت میں پھل آنے آتے مدتیں گزر جاتی ہیں ـــــ صدیوں پہلے جو کچھ ہوا اس کا اصل نتیجہ تو اب ظاہر ہو رہا ہے ـــــ ابن تیمیہ اور ابن قیم تو بیچ کی کڑی تھے ـــــ اِس لیے بوکھلاؤ مت ـــــ فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے ہتھیار ڈالنا تمہاری تقدیر ہے ـــــ خواہ اِس تقدیر تک پہنچنے کی مدت کو تم کھینچ تان کر کتنی ہی طویل کیوں نہ کر لو ـــــ "

مگر حقیقی صورت حال یہی ہے کہ چہار دانگ عالم میں خارش زدہ جھبرا کتّا دوڑ رہا ہے اور اُس کے لعاب کو لوگ آب حیات سمجھ کر شیشوں میں جمع کر رہے ہیں ـــــ اور میں خنزیروں کے حملے کے خوف سے بیدھا نہیں ہو پا رہا ہوں ـــــ ایک سمت بچاتا ہوں تو دوسرے حملے کا شکار ہو جاتا ہوں ـــــ دوسری کی حفاظت کی سبیل نکالتا ہوں تو تیسری سمت پر حملہ ہو جاتا ہے ـــــ تیسری سمت کا بچاؤ کرتا ہوں تو چوتھی سمت کا محاذ کھل جاتا ہے ـــــ

کیا مجھے ہمیشہ کج ہی رہنا ہو گا ؟

کیا راہِ مستقیم میرا مقدر نہیں ؟

عزیزم مارکس —— آپ کو تو پوہ پوہ کر دوں —— مگر یونگ سلمہ

ہاں یار —— تمہیں زیادہ بڑا مسئلہ ہو کہ ابو الفصاحت میر دُرِّ شہوار علی خاں بہادر کچھ سننے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں —— اور بے پیکر سایہ صفت ہمزاد ہوا کی طرح سارے میں تیر رہا ہے، اور آئینے کا زنگ چھٹتا نہیں ہے —— اور صحرا میں ہتھیلی پر اپنا سر رکھے اتھاہ انتظار میں ڈوبا اُداس ہرن اُس بے پیکر سوار کے انتظار میں ہے جس سے صحرا آباد ہے —— اور سوار کا بے جان جسد ناقہ پر رکھ کر بھیانک رات کی ویرانی، سناٹے اور اندھیرے میں کسی سمت روانہ کر دیا گیا ہے ——

بعضوں نے کہا —— ایک نہیں، بلکہ چار برق رفتار ناقوں پر تین مثالی اجسام اور ایک حقیقی جسم سوار کیا گیا اور چاروں ناقوں کو صحرا کی چار دھند بھری سمتوں میں روانہ کر دیا گیا —— پتہ نہیں بے جان جسد نے کہاں قرار پکڑا —— ناقہ کہاں رُکا —— کہ صحرا کی دھند میں گھرا اُداس ہرن، ہتھیلی پر اپنا سر رکھے بے پیکر سوار کا منتظر ہے —— اور —— چہار دانگ عالم میں ایک خارش زدہ جھبرا کتّا اپنی ڈراؤنی آنکھوں، ڈراؤنے چہرے، اور لپ لپ کرتی باہر نکلی سُرخ سُرخ زبان سے لعاب گراتا چہار سمت دوڑ رہا ہے —— اور تم

تم —— ابو الفصاحت میر دُرِّ شہوار علی !

اُس بدبودار کتّے کا لعاب آبِ حیات سمجھ کر جمع کرتے ہو —— صبح و شام پیتے ہو —— اور جلا وطن کیے جانے والے سے خفا ہوتے ہو ——"

یہ شاید صدیوں سے ہو رہا ہے۔

اور وہ بھی صدیوں پہلے کا واقعہ ہے۔

جو کچھ ہوا ـــــ صدیوں پہلے کی بات ہے ـــــ مگر میں کیا کروں ؟

معاشی مسئلہ مذہبی بن چکا ہے، اور میں خنزیروں کے حملے کے ڈر سے مسلسل بھاگ رہا ہوں۔

شاید کجی میری تقدیر ہے!

اور ایک خارش زدہ جھبرا کتّا چہار دانگ عالم میں دوڑ رہا ہے ـــــ مگر علاقہ کے لوگوں نے شناخت کا مسئلہ مشکل بنا دیا ـــــ کہ وہ خود علاقہ کی شناخت فراموش کر گئے ـــــ مگر دل کہتا ہے، شاید یہ وہی جگہ ہو ـــــ فیصلہ مشکل لہٰذا تفریق محال ـــــ

ایسے میں میرا فیصلہ کیا ہونا چاہئے ـــــ برادر میر شہوار علی ؟

میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں اور جب (جواباً) صحرا میں ہتھیلی پر اپنا سر رکھے انتہاہ انتظار میں ڈوبا اُداس ہرن مجھے ذبح ہوتے کبوتر کی طرح ٹک ٹک تاکتا ہے تو میں جلدی جلدی کمرے کے تمام دریچے بند کرنے لگتا ہوں ـــــ اور میرے چاروں طرف فضائے آسمانی کی دھند میں گم ہوتے کسی برق رفتار ناقہ کے قدموں کی چاپ گونجتی ہے ـــــ اور کسی اُجاڑ ویران گھر میں کوئی بوڑھا اپنے جسم پر بھبھوت ملے ـــــ اپنے دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹتا اور اپنا خون پیتا ـــــ وحشت زدہ بھیانک سناٹے کی آماج گاہ آنکھوں سمیت آنگن کے بیچوں بیچ مادر زاد برہنہ کھڑا ـــــ آسمان تاکتا رہتا ہے ـــــ اور چیختا رہتا ہے ع ـــــ

وعدۂ دیدار کجا است ؟ ؟

مدتوں یہ ہنگامہ برپا رہتا ہے ——— بھیانک رات نہ ایک پل اُدھر ہٹتی ہے نہ ایک پل اِدھر بڑھتی ہے ——— ستارۂ سحری کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ دیکھئے سحر کب ہوتی ہے ——— اور ———

اور پھر یوں ہوا کہ میں نے دریچے کے شگاف سے جھانکا ———"

"ایک شخص —— سر سے پیر تک لہولہان ——— زخموں سے چور چور ——— اکہتّر پیاروں کو اپنے سامنے قتل ہوتا دیکھنے والا ——— دشمنوں میں گھرا ہوا گھٹنوں کے بل اپنے خیمے کی طرف بڑھ رہا ہے ——— اور دشمنوں کے نیزے بار بار اُسی کا راستہ روک رہے ہیں ——— اور ہر بار وہ مقابلہ کر رہا ہے ——— خیمہ دور ہے۔ دشمنوں کی یلغار شدید ——— اور اُس کی پیش قدمی جاری ———"

میں بے اختیارانہ دریچے سے کنارے ہٹ جاتا ہوں۔

اور اب آخری صورتِ حال:

ابو الفصاحت میر دُرِّ شہوار علی بہادر نہ کچھ سننے پر آمادہ ہیں نہ جگہ چھوڑنے پر ——— بچھوں میں گھرے فصاحت و بلاغت کا دریا بہا رہے ہیں اور گاؤں سے آئے ہرکارے پر خفا ہو رہے ہیں ——— سایہ صفت ہمزاد بے تابانہ رقص کر رہا ہے اور چیخ رہا ہے ——— بسوئے غریباں امیر آمدی ——— اور میں ایک ایسے کمرے میں بند ہوں جس کے دروازوں پر مہر لگی ہے ——— اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند ہیں! ——— مگر کواڑوں میں پیدا ہو جانے والی "جھریوں" پر کس کا اختیار ہے ———؟؟

تو میں بند کمرے میں بند ہوں اور ماتم کر رہا ہوں ———"

وا محمدا ——— وا محمدا ——— وا محمدا ———

گھٹن

اگر کسی سے کہہ دوں تو مارتے مارتے میرا بھُرتہ باہر کر دے گا۔

دمِ رقص ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور اُسی پل ایک قلندر نے نعرۂ مستانہ بلند کیا ع خود تیغ زدی بر من ... صاحبِ سجادہ کیفیت کی انتہا پر مقیم ہیں ـــــ اور میرا سجادہ " لاشئیت " کے بھنور میں اُبھر رہا ہے۔ اور ڈوب رہا ہے اور ـــــ

اور میں محوِ رقص ہوں کہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔

بہت پہلے معاشی نصاب کی کسی شق کی تفصیلات پڑھتے ہوئے پڑھا تھا " ضرورت ایجاد کی ماں ہے ! " ـــــ مگر اب محسوس ہوتا کہ یہ جھوٹ ہے ـــــ شاید مجبوری ایجاد کی ماں ہے۔ "

کیا ضرورت مجبوری کا دوسرا نام ہے؟ یا مجبوری ضرورت کا دوسرا نام ہے ـــــ؟

شاید اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ صرف اضطراری طور پر صورت حال ایسی پیدا ہو گئی کہ ویسا ہو گیا ـــــ ہر صفحے کی ہر سطر کون پڑھتا ہے ـــــ کتابوں کو چھو کر اور سونگھ کر یہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ اُس کے بعد سکون رہا ـــــ

مگر سکون کہاں ہوا؟

جگمگاتے نگر میں ــــــ؟ غدار شہر کے آس پاس مقتل کے اِرد گرد؟

سکون کہیں نہیں ہوا ــــــ سانپ پھن کاڑھے دروازے پہنچتا، شکلیں بدل بدل کر پہنچتا، اور لوگوں کے دلوں میں تناور درخت نے اپنی جڑیں مضبوط کر لیں ــــــ اور مُنھ اس قابل نہیں رہے کہ کھل سکیں۔ قلم کی روشنائی سوکھ گئی اور کاغذ بنانے کی گھریلو صنعت کا دیوالیہ نکل گیا۔

اور تب ایسے میں "مقتل کا بیمار" ایک گوشے میں بیٹھا وِرد کرتا رہا ــــ نادِ علیاً مظہر العجائب ــــــ اور عجیب و غریب باتوں کا ظہور ہوتا رہا۔

آدمی کا کچا گوشت کھانے والے کے پوتے نے چہار دانگ عالم میں ہم اور ظلم کا وہ کاروبار رچا کہ مقتل کے آخری لاشے کے خون میں تر بتر سفید کبوتر گنبد پہ بیٹھا رہا اور ایک صابر عورت پھٹی پھٹی اُداس آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی رہی اور انتہائی اضطراب کے عالم میں پکارتی رہی ــــ یا جدّاہ ــــ یا جدّاہ اور سانپ کے "من" کی تلاش میں "بجو" کو روشنی کا استعارہ سمجھنے والے بکھتے رہے ــــ یورش ــــ یورش ــــ یورش ــــ اور بہتوں نے تو یہ بھی نہ لکھا۔ صرف طوطے کی طرح رٹتے رہے ــــ سکون ــ سکون ــ سکون

اور مقتل کا بیمار چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتے آگ کے سمندر میں سکون و اطمینان کے انتہائی درجات پہ فائز ــــ ذکرِ اثبات و نفی میں مشغول رہا ــــ اور بصرہ کا فقیر اک گوشۂ قفس میں اٹھارہ ہزار عالم کا معائنہ کرتا رہا اور ظاہر و باطن کی دنیائیں الگ الگ سجتی رہیں ــــ کیوں کہ گذرے ہوئے زمان میں ایک شخص صرف اِس لیے جلا وطن کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنے

مرشد کی دی ہوئی تعلیم لوگوں میں عام کر رہا تھا۔

اور دوسرا شخص اُس شخص کو مکاری سے شکست دے کر کرسی نشیں ہو چکا تھا جو آنے والے سے ذاتی گفتگو کرتے ہوئے چراغ صرف اِس لیے بجھا دیا کرتا تھا کہ وہ چراغ دوسرے مد سے روشن تھا۔ ـــــ احتیاط کے اسی رویئے کا انعکاس اُس رویئے والے کے یہاں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے جو کھیر کا خواہش مند تھا۔ مگر میرا رویہ ـــــ؟

اگر کسی پر ظاہر کر دوں تو مارتے مارتے میرا بھُرتہ بنا دے گا۔

مگر میں کیا کروں؟ ـــــ آخر کیا کروں کہ میرا سجّادہ لامکاں کی لاشئت کے بھنور میں اُبھر رہا ہے اور ڈوب رہا ہے اور میں محوِ رقص ہوں۔

میں محوِ رقص ہوں کہ صدیوں سے میرے آبا و اجداد بھی ناچتے آئے ہیں، پھر میں کیسے انکار کر سکتا ہوں ـــــ کیسے انکار کر سکتا ہوں کہ یہ میرے رزق کا معاملہ ہے ـــــ

ظاہر اور باطن کی ایسی تیسی ـــــ نواب اعتماد الدولہ کار، کوٹھی، فون، فرِج سب کے مالک ہیں ـــــ خان بہادر انظار الدین خاں کا شہر میں کیا رعب ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا افیسر ان کو دیکھ کر بیٹھا نہیں رہ سکتا ـــــ اور اب تو محلّے میں آ کر نیا نیا بسنے والا موٹر مستری بھی دو منزلہ مکان کا مالک بن گیا ہے ـــــ مگر ہم کیا ہیں ـــ؟

ہاں ہاں، ٹھیک ہے ـــــ پہلے ایسا ہوتا ہو گا ـــــ بہت بڑے بزرگ تھے میرے آباؤ اجداد ـــــ ہوں گے ـــــ جائے نماز کے نیچے ہاتھ ڈال کر ہزار پانچ سو کسی کو دے بھی دیتے تھے ـــــ دیتے ہوں گے

دستِ غیب جب گھڑی میں نہیں تو سارے عالم کے فیض یاب ہونے کی کہانی
بے معنی ___ ہاں یہ بھی ٹھیک ___ مان لیا میں نے ___ بڑے عالم فاضل
صاحبِ کرامت بزرگ تھے ___ ارے بابا سب ٹھیک، سب ٹھیک ___
لیکن سب بے معنی ___ عبث ___ خیال کوندے کی طرح لپک رہا ہے۔
اور میں محوِ رقص ہوں ۔

اور تب دمِ رقص اچانک یہ خون آشام ساعت مجھ پر آن پڑی کہ ساری
ساعتیں گُنج ہوگئیں اور ___ ایک ساعت ___ بس ایک ساعت دم سادھے
کھڑی رہی ___ اور اُس ساعت کے چاروں طرف ایک سانپ پھن کاڑھے
جھومتا رہا ___

تو گویا یہ اب میرے دروازے پر بھی آن پڑا۔ بے خبری فنا کی تمثیل بنی
اور ایک خبر صدیوں کا سفر طے کرتی مجھ تک پہنچنے کے تدریجی عمل میں مصروف
رہی ___ مگر نہیں پہنچی ___ اور میں محوِ رقص رہا ___ میں محوِ رقص رہا۔
سانپ لپ لپ کرتا میرے محوِ رقص وجود کے اندر باہر، چاروں طرف مست
ہو ہو کر جھومتا رہا ___ اور میں اینٖ وُاں سے بے نیاز نعرۂ مستانہ بلند کرتا
رہا کہ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے ___

اور تب ایسے میں اچانک دادا (اللہ سلامتی نازل کرے اُن پر)
غصّے میں بھرے آگئے اور مجھے پٹخ کر میرے سینے پر چڑھ گئے اور دونوں ہاتھوں
سے مجھے طمانچے مارنے لگے ___ کمینے مجھے ذلیل کرتا ہے ___ یہی سکھایا
تھا میں نے ___ بول ___ بول کم بخت ___ بول ___ میں نے
جسے طلاق دیا تو نے اُس کے ساتھ بیاہ رچا لیا؟ ___ ارے نالائق!

اگر میں یہی کرتا تو آدم خور کی اولاد میرے سامنے تک باقی ہے۔ ننگِ خاندان ننگِ اسلاف — بدبخت ——" دادا کا غصّہ اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔

اور تب میں نے ریسمان سے اُن کے طمانچے کھاتے ہوئے مسکرا کر کہا —— "میرا کیا قصور ؟ کئی پشت سے تو یہی سکھایا گیا اور اُس شاعر کو ملحد کہا جاتا رہا جو ناموس بیچنے کی بات کرتا تھا ——" تو دادا کا غصّہ ذرا تھما اور نہایت گمبھیر لہجے میں بولے —— "ہاں تیرے پہلے والے بدنیت تو نہیں تھے مگر حالات کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے —— یہ صحیح ہے کہ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے —— مگر شہود کو صندوق اپنے ساتھ قبر میں لے جانا چاہیے تھا۔"

پھر اچانک کہیں غائب ہو گئے —— پھر صاحبِ سجّادہ بھی دھند میں کھو گئے —— حاضرین کی صفیں بھی فنا آشنا ہو گئیں —— قوال بھی عدم سے پرے چلا گیا — آواز بھی فنا ہو گئی — صرف سُر باقی رہ گیا — قرن ہا قرن کی دوری طے کرتا — مجھ تک انتہائی کمزور گونج کے ساتھ پہنچا ایک سُر ایک بے نام سُر ——

"——————"

"——————"

"——————"

"ایک بے نام سُر —— بے پیکر ، بے چہرہ، اور بے آواز سُر اور میں ——"

پتہ نہیں میں بھی تھا یا نہیں —— لیکن میرے چاروں طرف بدبو ضرور تھی —— شاید بجباتے زخموں کی بدبو یا شاید کوڑھی اجسام کی

ناقابل برداشت بُو ——— یا شاید کھُلا ہوا گٹر ——— یا شاید پہنچا نہ لے جانے والی گاڑیوں کا اژدھام ——— اور بس ——— اور میں ——— اور سامنے میرے بزرگوں کے مزارات ———

اور کوندے کی طرح لپکتا ایک خیال ——— کسی سے کہہ دوں تو مارتے مارتے میرا بھُرتہ باہر کر دے گا ——— مگر میں کیا کروں ——— آخر کیا کروں؟ ——— کہ خیال بار بار کوندے کی طرح لپک رہا ہے ——— اور میں محوِ رقص ہوں ———"

میں محوِ رقص ہوں، اور سرائے میں ڈھولک کی تھاپ پر کوئی رنڈی گا رہی ہے ——— میں جو ہوتی راجا بیلا چمبیلیا ——— میں مسلسل محوِ رقص ہوں اور آواز مسلسل گونج رہی ہے ——— میں جو ہوتی راجا بیلا چمبیلیا ——— توبہ، توبہ استغفراللہ ——— میں لاحول پڑھتا ہوں ——— ذہن کو مقامِ فنا تک لے جانے کی کوشش کرتا ہوں ——— مگر سب بیکار ———"

میرا سجّادہ لامکاں کی لاشیئیت کے بھنور میں اُبھر رہا ہے اور ڈوب رہا ہے اور میں محوِ رقص ہوں ———

اور ایک خیال بار بار کوندے کی طرح لپک رہا ہے ———
کسی سے کہہ دوں تو مارتے مارتے میرا بھُرتہ باہر کر دے گا۔

●●

سولی اوپر سیج پیا کی

زمان و مکان کی کیفیت کچھ یوں ہے کہ ہر چہرہ ناشنا سا ہے اور ہر لہجہ پرایا۔ لوگوں کا اژدہام ہے ــــ چاروں طرف ــــ جہاں میں ہوں، وہاں سے چاروں طرف دور دور تک جہاں نظر جاتی ہے، اور کان جن سرحدوں کی صداؤں کے امین ہیں ــــ تمام اطراف آوازیں ــــ بس آوازیں ہی آوازیں ــــ"

فضا تقدس سے بھرپور، لوبان، اگربتی اور کافور کی مہک، تلاوت کی آواز، پاکیزہ سرگوشیاں، اشخاص مودّب (شاید باوضو بھی) مخصوص لباس اور مخصوص انداز گفتگو (شاید مخصوص انداز فکر بھی)

سماں! جب جاتے ہوئے دن سے شام گلے ملتی ہے ــــ کہ نہ یہ کہہ سکو کہ دوپہر ہے، نہ یہ سوچ سکو کہ شام آ گئی ــــ

اور لحظہ لحظہ قریب ہوتی ہوئی آواز ؎

کن بر سر تابوتم یک جلوہ برعنائی

لے! در لب لعل نوا اعجاز مسیحائی

قوال لہک لہک کر گا رہا ہے" در لب لعل نوا اعجاز مسیحائی ـ اے وا

اعجاز مسیحائی ـــــ ہاں ! اعجاز مسیحائی ـــــ" حاضرین پر وجد کی کیفیت ہے اور میں ساکت و جامد، کبھی اپنے سامنے دیکھتا ہوں، کبھی ان لوگوں کی طرف جو وجد میں ہیں۔

دھندلکوں کے اس حصار میں گھرا جب میں اس وقوعے کے بارے میں سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ جہاں میں ہوں وہاں ایک بہت پائے کے بزرگ کا مزار ہے، آج ان کی تاریخ وصال ہے، اور ان ہی کے عرس کا ایک منظر اتنا عجیب ہوگیا ہے کہ میری فہم کو دیمک چاٹ گئی ہے۔

مزار ایک بہت بڑے روضہ کے اندر ہے، حجرۂ اقدس میں چاروں طرف مومی شمعیں روشن ہیں۔ اگربتی، عود اور لوبان کے دھوئیں اور خوشبو سے فضا میں عجیب قسم کی سرّیت اور غیر مادی فضا کا تاثر تیر رہا ہے اور اس پر یہ خیال کہ صاحب مزار جلالی بزرگ ہیں، فضا کی پُراسراریت میں اور اضافہ کر رہا ہے اندر جو حضرات جمع ہیں وہ سرگوشیوں میں تلاوت میں مصروف ہیں اور گویا ان کی یہ خاموش آوازیں بھی اس سرّیت کا عنصر ہیں ـــــ

صاحبِ سجّادہ اندرونِ حویلی سے چادر مبارک لے کر باہر آچکے ہیں اور یہاں تک پہنچنے کی راہ میں ہیں۔

حجرے کے باہر بہت بڑا صحن ہے جس میں چاروں طرف قناتیں باندھ دی گئی ہیں۔ قناتوں میں رنگ برنگی بندھی جھنڈیاں احاطے کا حسن بڑھا رہی ہیں، حجرے کے باہر لوگ باگ خوش گپیوں میں مصروف ہیں، پاس ہی مختلف قسم کی دکانیں سجی ہیں، نقل کی، اگربتّی کی، پھول کی، کتابوں کی ـــــ چینا بادام، شیرنی، کھلونے، رنگ برنگی اشیاء ـــــ

تو میں اسی حجرے کے اندر ہوں اور صاحب سجّادہ سر پر چادر لیے آہستہ آہستہ مزار شریف کی طرف بڑھتے آرہے ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ خود صاحب سجادہ بھی بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں میں ان کے مریدوں سے ان کی بے شمار کرامتیں سُن چکا ہوں۔ ایک مُرید نے تو یہاں تک بتایا کہ حضرت نے ایک مُردہ زندہ کر دیا تھا۔ ویسے چہرہ بھی بہت نورانی ہے۔ بلند پیشانی، سینے تک سفید داڑھی، شیروانی، عبا، دستار، کندھے پر لمبا سا رومال اور سر پر چادر مبارک ـــــ ان کے ارد گرد ان کے مریدوں کا حلقہ ہے اور خود صاحب سجادہ وجد میں ہیں۔

قوّال نے دوسری قوالی شروع کی،

ہم لائے ہیں سرکار میں سرکار کی چادر ـــ"

میں چونکہ سامنے دیکھتا ہوں، اور پھر صاحب سجادہ کی طرف، جو وجد میں ہیں۔ ـــــــ"

میں آنکھیں ملتا ہوں، سوچتا ہوں شاید یہ میری آنکھوں ہی کا قصور ہے، لیکن میں اپنے وجود سے پوری طرح منسلک ہوں، یہ احساس بھی مجھ پر حاوی ہے اور شاید یہی میرا قاتل بھی ہے! ابھی ابھی صاحب سجادہ نے قوال کو ایک روپیہ دیا۔

اور دیکھتے دیکھتے پچاسوں روپے حضرت کی نذر ہوتے ہوئے قوال تک پہنچ گئے۔ ـــــــ

صاحب سجادہ کچھ اور قریب آگئے ہیں۔

اب لوگ تقریباً دو رویہ صفیں بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں، حجرہ کے اندر

تلاوتِ قرآن میں مصروف حضرات کبھی تلاوت ملتوی کر کے حضرت کے استقبال کے لیے چشم براہ ہیں ـــــ حضرت اب روضہ کے احاطے میں داخل ہو چکے ہیں، اور قوال گا رہا ہے ـــــ

ے شیشے کھنکے ساغر چھلکے گردش میں پیمانے آئے
ساقی تری ان آنکھوں کی قسم سب چھوڑ کے میخانے آئے

اور آخر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا ہے ـــ
میں بغل والے سے پوچھ ہی لیتا ہوں۔ "آپ کچھ دیکھ رہے ہیں؟"

"کیا؟" ـــ

"سامنے" ـــ

"کیا سامنے؟"

کچھ کہنا چاہتا ہوں، مگر دو سرخ سرخ آنکھیں مجھے گھورتی ہیں، اور میں کانپ کر خاموش ہو جاتا ہوں ـــــ

اب میں کیسے بتاؤں کہ جن بزرگ کا عرس ہے، ان کا مزار مبارک بیچ سے چاک ہو گیا اور خوشبوؤں کی لطیف اور عطر بیز لہریں اور جھونکے مجھے چھوتے ہوئے گزر گئے ـــــ پھر میں نے دیکھا کہ وہ بزرگ جو صدیوں پہلے یہاں دفن کیے گئے تھے، فوراً کھلے پھول کی طرح شگفتہ اور تر و تازہ ہیں اور میری طرف دیکھ کر متبسم ـــــ مزار مبارک کے داہنی سمت ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور اس سے جنت کی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے ـــــ

لیکن یہ سب کچھ میرے لیے بہت زیادہ حیران کن نہیں ہے۔

میرے لیے حیرانی کا باعث تو یہ ہے کہ صدیوں پہلے دفن کیے گئے یہ بزرگ

تر و تازہ ہیں اور میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ ـــ حجرے کے باہر خوش گپیوں میں مصروف حضرات ـــ چادر مبارک کے ساتھ ساتھ آتے ہوئے مریدین، خلفاء ـــ اور خود صاحب سجادہ ـــــ سب کے سب مُردہ ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ پیپ اور بدبو سے دماغ پراگندہ ہو رہا ہے ـــــ

اگر حضرت کے جسد مبارک سے اُٹھتی ہوئی خوشبوؤں کی لپٹیں نہ ہوتیں تو میں اب تک بے ہوش ہو گیا ہوتا! اور اب یہ مُردہ، سڑے گلے، پیپ اور بدبو کا مرکز بنے ہوئے ڈھانچے حجرے کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔

قوالوں کے مُردہ ڈھانچوں نے ڈھولک کی تھاپ پر مصرع اُٹھایا:

ع رنگ ہے، رنگ ہے، میرے ساجن کے گھر رنگ ہے
میرے مرشد کے گھر رنگ ہے ـــــ
میرے داتا کے گھر رنگ ہے ـــــ
ہاں! رنگ ہے جی رنگ ہے، رنگ ہے ـــــ

اور اب صاحب سجادہ نے چادر ہاتھ میں لی ہے ـــ اور مزار مبارک پر چڑھانے والے ہیں ـــــ

اچانک منظر پھر تبدیل ہو جاتا ہے۔

اب تک تو قبر میں صرف وہی حضرت، تنہا آرام فرما تھے، تر و تازہ اور شگفتہ تھے اور متبسّم بھی ـــــ لیکن جیسے ہی صاحب سجادہ نے چادر ہاتھ میں لی ـــــ اچانک حضرت اُٹھ کر بیٹھ گئے ـــــ آنکھیں سُرخ، غصّے سے چہرہ تمتمایا ہوا ـــ اور پل بھر میں قبر بہت سارے لوگوں سے بھر جاتی ہے۔ ان میں بعض نے اپنے جسم پر بھبھوت مل رکھا ہے، بعض کے ہاتھوں میں اپنی

کٹی ہوئی گردنیں ہیں اور بعض اپنے خون میں خود نہائے ہوئے۔

اور پھر، دور بہت دور سے ـــ دف کی آواز سے ہم آہنگ ہوتا ہوا ایک نغمہ ـــ سولی اوپر سیج پیا کی، کیسے سونا ہووے

ہے ری میں تو ...."

اور پھر تمام حضرات رقص میں آجاتے ہیں۔ اور وہ چھوٹی سی قبر وسیع ہو کر پوری کائنات پر حاوی ہوجاتی ہے اور اس قبر میں مُردے زندگی کی پوری حرارت تروتازگی اور جلال آمیز انداز کے ساتھ رقصاں ـــ اور صحراؤں، پہاڑوں، دریاؤں، خشکیوں ـــ قرنہا قرن کا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچتی ہوئی ایک آواز ـــ سولی اوپر سیج پیا کی کیسے سونا ہووے

ہے ری میں تو پریم دوانی ...."

اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا؟ اور کیا نہیں ہوا!

بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ جب قوال نے یہ غزل شروع کی کہ...

ـــ از حسنِ ملیح خود شورے بہ جہاں کردی

دل بُردی و جاں بُردی بیتاب و تواں کردی

تو مجھ پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی اور جب قوال اس مصرع پر پہنچا کہ ع بے جرم و خطا میرم تو ناز بتاں کردی

تو اچانک مجھ پر شدید وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور مسلسل ایک گھنٹے تک صرف ایک مصرع پر رقص کرتا رہا ـــ رقص ـــ رقص ـــ رقص ـــ زمان و مکان کی تمام حدوں کو توڑتا ہوا رقص ـــ قبر میں کٹی گردنیں اور اپنے خون میں تربتر اجسام رقصاں ـــ اور قبر کے باہر میں ـــ پھر اندر باہر کا

فرق مٹ گیا — یا تو میں قبر والوں میں شریک ہو گیا، یا قبر والے مجھ میں شامل ہو گئے۔
اب بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ کیا ہے ؟ وہ کیا تھا ؟
کیا راج ہنس اپنا آخری گیت گا رہا تھا ؟ یا شیو تانڈو ناچ رہے تھے ؟
جواب آج تک شناسائی کے لمس سے محروم !
پتہ نہیں —— کیا صحیح، کیا غلط !
یاد صرف اتنا ہے کہ اسی عالم میں سحر ہو گئی .....
اس لمحۂ جاں سوز کے گذر جانے کے بعد۔
بعضوں نے کہا " یہ دراصل تمہاری دہریہ طبیعت کے لیے ایک تنبیہ تھی۔
کچھ حضرات کے خیال میں " بود تھا، است ہے !"
اور جہاں تک میرا سوال ہے — راتوں کے شدید گہرے پُراسرار اندھیرے
میں بھی بس ایک منظر روشن :
قبر — قبر میں ڈھیر سارے لوگ — بھبھوت ملے ہوئے کٹی ہوئی
گردنیں ہاتھوں میں لیے ہوئے —— اپنے ہی خون میں تر بتر۔
اور ایک آواز — صحراؤں، پہاڑوں دریاؤں، خشکیوں ——
قرنہا قرن کی منزلیں سر کرتی ——
ایک آواز —— صدیوں کا سفر کرتی —
مجھ تک بار بار پہنچتی —— ایک آواز ——

ع سولی اوپر سیج پیا کی کیسے سونا ہووے

ہاں بھیّن —— آپ ہی بتاؤ —— کیسے سونا ہووے ؟

●●